مقالاتِ

دینی و علمی

حصّہ دوم

چند دینی و علمی، تحقیقی تقریریں اور مقالے

از

پروفیسر مولوی محمّد شفیع ستارۂ پاکستان

ڈی۔لِٹ۔ او ایل، ایم۔ اے (کینٹب)

صدر شعبۂ دائرۂ معارفِ اُردُو

سنہ ۱۹۶۱ء

مطبوعہ دین محمّدی پریس لاہور

قیمت:۔ چار روپے

عرضِ حال

والدِ بزرگوار پروفیسر مولوی محمد شفیع کے بعض دینی اور علمی مضامین کتابی صورت میں ۱۹۶۰ء میں شائع کیے تو راقم سطور نے اِس ارادے کا اظہار بھی کیا تھا کہ اِس سلسلے کی اَور تقریروں کو حصّہ دوم کی صورت میں طبع و نشر کیا جائے گا۔ بتوفیقِ ایزدی یہ ارادہ پورا ہُوا اَور کچھ تقریروں اَور چند مقالوں کو اِس حصّے میں شائقین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

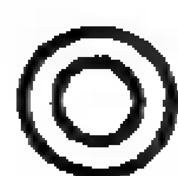
جو تقریریں اِس مجموعے میں شامل ہیں اِن کے لیے ہم ریڈیو پاکستان کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ان کے طبع کرنے کی اجازت دی۔

۲۱ر جنوری ۱۹۶۲ء

العارض
مُصطفےٰ کمال
ایم۔ اے



فہرست مقالات



عرب کے شاعر

(۱) الطِرِمّاح بن حکیم

بنی اُمیّہ کے زمانے میں سیاسی شاعری کا زور تھا۔ آلِ مروان نے قبائلِ عرب کی مدد سے خلافت پر غلبہ پایا تھا اور قبائلِ عرب شعر سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے اس دَور میں شعر کو لازمی طور پر سیاسی پروپیگنڈے کا اہم جز، قرار دیا گیا تھا، تاکہ حکومت کو معاونینِ حکومت کی تائید حاصل رہے اور دُشمنانِ حکومت کو خوفزدہ کیا جا سکے۔ اگرچہ جمہور حکومت کے ساتھ تھے مگر بعض احزاب مثلاً آلِ زبیر، خوارج، علویّین وغیرہم حکومت کے خلاف تھے۔ ان احزاب میں بھی شاعر موجود تھے اور ان میں سے بعض شعراء کا شمار فحول شعراء یعنی درجۂ اوّل کے شاعروں میں ہے۔ ایک حزبِ مخالف کا رکن خارجی شاعر الطِرِمّاح بن حکیم بھی تھا جو پہلی صدی ہجری کے مشاہیر شعراء کی صفِ اوّل میں شامل تھا۔ ہماری آج کی گفتگو کا موضوع وہی ہے۔

طِرِمّاح بنو طیّ ؔ میں سے تھا۔ عرب قدیم الایّام سے دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہیں یعنی معدّی عرب اور قحطانی عرب، یا دوسرے لفظوں میں شمالی عرب اور جنوبی عرب۔ بنو طیّ جنوبی عربوں میں سے ہیں۔ صدیوں سے ان کا آبائی وطن جَبَلا طیّ (بنو طیّ کے دو پہاڑ) یعنی

کوہ اَجَاؔ و سَلمیٰ ہیں۔ روایت یہ ہے کہ یمن کے سدِّ مأرب کے تباہ ہونے کے بعد بنو طیّٔ اور دُوسرے یعنی قبائل یمن سے ہجرت کر کے عرب کے شمالی علاقوں میں آ بسے۔ طیّٔ نے اپنا نیا وطن کوہ اجأ و سلمیٰ کو بنایا اور اس علاقے میں اس قدر نام پیدا کیا کہ سریانی زبان بولنے والے اُن کے شمالی پڑوسیوں نے اپنی زبان میں "طیّایا" (یعنی طائی) کو پہلے عرب اور پھر مسلمان کا مرادف قرار دیا اور اسی طرح ان کے مشرقی پڑوسیوں نے تازی کو جو غالباً طائی ہی کی فارسی صورت ہے، عرب کا مرادف سمجھا۔ مشہور سخی حاتم طائی کو کون نہیں جانتا۔ حاتم نے اس قبیلے کا نام دُنیا بھر میں روشن کیا۔ ۹ھ ہجری میں بنو طیّٔ کا ایک وفد رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ان میں قیس بن جحدر طائی بھی شامل تھا۔ جو اِس قبیلے کا سب سے پہلا مسلمان تھا۔ یہ قیس بن جحدر طِرِمّاح کے دادا کا دادا تھا۔

طِرِمّاح لغت میں دو معنی رکھتا ہے۔ طویل اور متکبّر۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ طرمّاح اِس شاعر کا نام تھا اور بعض اسے لقب بتاتے ہیں۔ علّامہ عینیؔ (حاشیہ خزانۃ الادب ۳/۲۱۲) نے لکھا ہے کہ اس کا نام حَکَم اور لقب طِرِمّاح تھا۔ معتبر روایت یہ ہے کہ اس کی ولادت مُلک شام میں ہوئی اور وہیں اُس نے نشوونما پائی۔ جوان ہو کر وہ حکومت کی فوج میں بھرتی ہوا اور کوفے پہنچا۔ جہاں وہ محلّہ تیم اللّات بن ثعلبہ میں مقیم رہا۔ اس قیام کے دوران میں وہ ایک خارجی شیخ کی مجلس میں آتا جاتا رہا اور اس کی باتیں سُن سُن کر اِس قدر متأثر ہوا کہ اُس نے خارجی مذہب اختیار کر لیا اور مرتے دم تک اس پر قائم رہا۔

فوجی خدمت کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے وہ چندے ایران کے مختلف شہروں میں مقیم رہا۔ موجودہ دیوان کے پہلے ہی قصیدے میں وہ کرمان کے شہر بَمّ میں موجود ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ ایک اور قصیدے میں اس کے فجّ الرّیح اور قزوین میں ٹھہرنے کا ذکر ہے

اس کے علاوہ کتاب البیان والتبیین میں جاحظ نے لکھا ہے کہ وہ کرے میں بچوں کو علم ادب کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اور بحیثیت معلّم کے اس قدر کامیاب تھا کہ بچے جو اُس سے پڑھ کر جاتے تھے، ان کی نسبت گمان ہوتا تھا کہ گویا مدّتوں علمار کی مجلس میں بیٹھتے رہے ہیں!

بالآخر وہ کوفے میں لوٹ آیا اور وہیں ۱۰۵ھ میں فوت ہوا۔ اغانی میں ابن شُبرُمہ کی روایت ہے کہ طرمّاح ان کا ہم مجلس تھا۔ کئی دن وہ شریکِ مجلس نہ ہوا تو اس کے احباب اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے کہ اس کے نہ آنے کا سبب دریافت کریں۔ اس کے گھر کے قریب پہنچے تو ایک جنازہ ملا۔ جس پر سبز خزّ کی کڑھی ہوئی چادر پڑی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ طرمّاح کا جنازہ ہے۔ اس کے دوستوں نے محسوس کیا کہ اُس کی وہ دُعا مقبول نہ ہوئی جس میں اس نے کہا ہے:۔

أذا العرش! إن حانت وفاتی فلا تکن	"اے صاحبِ عرش! اگر میری موت قریب ہے
علی شرجعٍ یُعلیٰ بخُضرِ المطارفِ	تو یہ موت مجھے سریرِ میّت پر نہ آئے جو سبز خزّ کی
ولکن أحِنْ یومی سعیداً بعُصبةٍ	چادر سے ڈھکا ہو، بلکہ موت مجھے سعادت کیساتھ
یُصابون فی فجٍّ من الارضِ خائفِ	ایسی جماعت کی معیت میں دے بخشو، جو کسی خطرناک
عصائبُ من شتّیٰ یؤلّف بینھم	درّے میں موت سے ملاقی ہو۔ ایسی جماعت
ھُدَی اللہِ نزّالونَ عند المواقفِ	جس میں مختلف گروہ شامل ہوں، جنہیں ہدایت
اذا فارقوا دنیاھُم فارقوا الأذی	ایزدی نے اکٹھا کر دیا ہو۔ وہ لوگ! جو رَن پڑے
وصاروا الی موعودِ ما فی المصاحفِ۔	تو پیدل ہو کر جنگ کرتے ہیں۔ جب وہ دُنیا

سے رخصت ہوتے ہیں تو دارِ محن سے رخصت ہوتے ہیں اور نعیمِ اخروی کو پاتے ہیں۔ جس کا وعدہ

کتاب اللہ میں کیا گیا ہے۔"

طِرِمّاح کی زندگی کے ایک واقعے کا ذکر تمام سوانح نگاروں نے کیا ہے۔ وہ اس کی اور کمیت بن زید شاعر کی دوستی ہے۔ ابنِ قتیبہ سے روایت ہے کہ کُمیت طرمّاح کا دوست تھا۔ دونوں ہمیشہ ایک دُوسرے کے ساتھ ہی نظر آیا کرتے تھے۔ کمیت سے کسی نے کہا۔ ہم نے تمہارے اور طرمّاح کے مخلصانہ تعلّقات سے بڑھ کر کوئی عجیب بات نہیں دیکھی۔ وہ شامی، تم کوفی۔ تم متعصّب مُعَدّی، وہ متعصّب قحطانی۔ وہ خارجی، تم شیعہ۔ وہ بدوی تم شہری۔ اس کے علاوہ تم دونوں شاعر ہو اور کہتے ہیں کہ ع

بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دُشمن

تو آخر کون سی وجہ ہے، جس کی بنا پر تبایُنِ مذہب اور شدّتِ تعصّب کے باوجود تم دونوں میں اس قدر اتّفاق ہے؟ کُمیت نے کہا وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں عامیوں کے ساتھ بُغض رکھنے میں متفق ہیں۔ حماسہ میں طِرِمّاح کے چند شعر دیے ہیں جو اسی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

لقد زادنی حُبّاً لنفسیَ انّنی	"اس بات نے میری ذات کو میرے لیے محبوب تر کر دیا ہے
بغیضٌ الی کلّ امریٍٔ غیرِ طائلِ	کہ ہر فرو مایہ اور ناقص آدمی کو مجھ سے بُغض ہے اور اس بات
وانّی شقیٌّ باللئام ولاتریٰ	نے بھی کہ میں ناقصوں کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتا رہتا ہوں
شقیّاً بہم الّا کریمَ الشمائلِ	اور تم دیکھوگے کہ ناقصوں سے وہی تکلیف اٹھاتا ہے

جس کی سرِشت میں جوانمردی ہو!"

طِرِمّاح کی طبیعت کی افتاد ایک اور واقعے سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ اغانی میں ہے کہ طِرِمّاح اور کمیت امیر مخلد بن یزید بن مہلّب کے ہاں گئے۔ پہلے طِرِمّاح پیش ہوا اور

قصیدہ پڑھنے لگا۔ امیر نے کہا، کھڑے ہو کر پڑھو۔ طِرِمّاح نے کہا: "بخدا شعر ایسی کم مرتبہ شئے نہیں کہ میں اس کے لیے کھڑا کیا جاؤں وہ میرے مقام کو پست کرے اور میں اپنی خواری سے اُسے پست کروں۔ شعر تو فخر کے خیمے کا عمود اور مآثرِ عرب کا ستائش خانہ ہے۔" امیر نے کہا، تمھیں ہماری شرط منظور نہیں تو جاؤ۔ اس کے بعد کُمَیت کو بُلوایا گیا اور اس نے کھڑے ہو کر قصیدہ پڑھا۔ اُسے پچاس ہزار درہم انعام میں ملے۔ کُمیت نے باہر آنے پر آدھا انعام طِرِمّاح کو دیا اور کہا۔ "اے دوست! مانا کہ تم ہمّت میں ہم سے بلند تر ہو، مگر ہوشیاری میں ہم تم سے زیادہ ہیں۔" بُغضِ عامّہ اور خودداری کے یہ دونوں واقعات غالب دہلوی کی زندگی کے ایسے ہی واقعات کو یاد دلاتے ہیں۔

شاعری کے علاوہ طِرِمّاح خطابت اور روایتِ شعر اور فصاحت اور شجاعت میں بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ کسی نے کُمَیت کو طِرِمّاح کا یہ شعر سُنایا:۔

"جب طِرِمّاح کی روح قبض ہوگی، تو جوانمردی کی اعتماد گاہ کمزور ہو جائے گی
اور قصیدوں کی باگ ڈھیلی لٹکنے لگے گی۔"

تو کُمیت نے جواب دیا:۔

"بخدا یہ سچ ہے اور یہی ضعف خطابت و روایت اور فصاحت و بلاغت کو بھی لاحق ہوگا۔"

مدائنی نے ایک راوی کا قول نقل کیا ہے کہ "طِرِمّاح کی باتیں اس قدر پُر تاثیر اور جاذبِ توجہ تھیں کہ میں نے اور کسی کی باتوں کو ایسا نہیں پایا۔"

طِرِمّاح نے اپنی بیوی سلمیٰ اور اپنی دو بیٹیوں صَمصامہ اور صُبَیرہ کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے۔

شعر میں طِرِمّاح کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ تبریزی شارح حماسہ نے ایک عالم کی رائے دی ہے۔ کہ اگر طِرِمّاح زمانے کے اعتبار سے ذرا پہلے ہوتا تو اس کو فرزدق اور جریر دونوں پر ترجیح دی جاتی۔ ناقدانِ شعر متفق ہیں کہ اُس کا شمار فحولِ شعراء میں ہے۔ افسوس ہے کہ اس کا دیوان مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچا۔ ممکن ہے اس کی وجہ اس کی خارجیت ہو اور کلام کا وہ حصّہ جو اس کے عقائد سے تعلق رکھتا ہو حذف کر دیا گیا ہو۔ بہر حال ابنِ ندیم نے ہم کو اطلاع دی ہے کہ تیسری صدی میں ثعلب نحوی اور (ابو الحسن علی التیمی) الطوسی نے اس کا کلام جمع کیا تھا۔ موجودہ دیوان بظاہر الطوسی کی روایت ہے۔ دیوان کے پہلے حصے میں تو وہ کلام ہے جس میں غریب الفاظ یعنی نادر اور قلیل الاستعمال الفاظ کی بھرمار ہے اور دُوسرے حِصّے میں وہ کلام ہے جو زیادہ تر ہجو پر مشتمل ہے اور جس کی زبان پہلی صدی کے شعراء کی عام زبان کے مطابق ہے۔

ابھی کہا گیا تھا کہ طِرِمّاح کے کلام میں نادر الفاظ کی کثرت ہے۔ یہ خصوصیّت اس کے معاصر رجز گو رُؤبہ کے کلام میں بھی موجود ہے۔ الفاظِ غریب کی وجہ سے لغت کی کتابوں میں طِرِمّاح کے اشعار بہت ملتے ہیں۔ جہاں یہ سند کے لیے درج ہوئے ہیں۔ صرف لسان العرب میں تین سو سے زیادہ حوالے طِرِمّاح کے موجود ہیں۔ کہتے ہیں کسی نے ابن الاعرابی سے جو معرفتِ لغت کے لیے مشہور تھا، شعرِ طِرِمّاح کے اٹھارہ مشکل الفاظ کے معنی پوچھے۔ وہ ایک کے معنی بھی نہ بتا سکا۔ ابوعمرو بن العلاء نے تو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اُس نے طِرِمّاح کو دیکھا کہ وہ سوادِ کوفہ کے آدمی بولنے والے نبطیوں سے پُوچھ پُوچھ کر غیر معروف الفاظ لکھ رہا تھا۔ غرض اس کی یہ تھی کہ ان کو عربی شکل دے کر وہ اپنے شعر میں استعمال کرے۔ اس سلسلے میں تبریزی نے ایک لطیفہ بھی لکھا ہے کہ

ایک دفعہ طِرِمّاح نے للکار کر کہا: "میں عربی زبان کے نادر الفاظ پر حاوی ہوں؛ کچھ پوچھنا ہے تو مجھ سے پوچھ لو"۔ اس پر حاضرین میں سے کسی نے کہا، "حضرت! لفظِ طِرِمّاح کے کیا معنی ہیں؟" طِرِمّاح کو اس کے معنی معلوم نہ تھے۔ والعہدۃ علی الراوی۔ اس کے دیوان کے یورپی ناشر نے کہا ہے کہ اس کی تحقیق میں طِرِمّاح کے دیوان کے بہت سے غریب الفاظ اور شعراء کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ طِرِمّاح کی غریب شناسی معاصروں کے لیے باعثِ رشک تھی اور مذکورہ تنقید اور لطیفہ بازی عجب نہیں کہ اسی رشک کی بناء پر کی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔

طِرِمّاح کا بہت سا کلام ہجو پر مشتمل ہے۔ ابن شرف قیروانی نے لکھا ہے کہ طِرِمّاح اپنے معاصر شاعروں، مثلاً نُصَیب، کُمَیت، ذوالرّمّہ (ابن مَیّادہ) سب سے ہجو میں فائق تھا۔ ہجو گوئی میں اس کا مقابلہ اکثر و بیشتر فرزدق سے رہا جو شاعرِ تمیم تھا۔ بنو تمیم آلِ مہلّب کے خلاف تھے۔ جب یزید بن مہلّب ۱۰۲ھ میں عقر کی لڑائی میں مارا گیا تو آلِ مہلّب کا خاتمہ ہو گیا۔ اور تمیموں نے جو شمالی عربوں میں سے تھے، جنوبی عربوں کے اس طاقتور گھرانے کی تباہی پر بغلیں بجائیں اور مفاخرت کا اظہار کیا۔ اس پر طِرِمّاح اور فرزدق کے مابین ہجاجاۃ شروع ہو گئی اور طِرِمّاح نے ایک نہایت تلخ ہجو کہہ کر فرزدق کو خاموش کر دیا۔ یہ ہجو ایک صدی سے زیادہ تک جنوبی عربوں کے لیے مایۂ ناز اور تمیموں کے لیے زہر کا گھونٹ بنی رہی۔ اندلس کے دُور دست علاقے میں ابن عبد ربّہ نے لکھا ہے کہ بزدلی اور فرار کے بارے میں کسی نے طِرِمّاح کی مذکورہ ہجو سے بہتر شعر نہیں لکھے۔ ذیل کے شعر اسی ہجو میں سے ہیں:-

فخرتَ بیومِ العُقْرِ شرقیَّ بابلٍ "تم نے عقر کی لڑائی پر جو بابل کے مشرق میں ہوئی

وقد اجبنت فیہ تمیمٌ وفلّتِ	فخر کیا ہے۔ حالانکہ تمیم نے اس میں بزدلی دکھائی اور
تمیمٌ بطرقِ اللؤمِ اھدی من القطا	شکست کھائی۔ فرومائیگی کی راہوں کی طرف تمیم جس یقین
ولو سلکت سُبُلَ الھدایۃِ ضلّتِ	سے رہنمائی کرتے ہیں، بھٹ تیتر اس یقین سے پانی کی طرف رہنمائی نہیں کرتے۔ لیکن اگر تمیم بزرگی کے راستوں پر چلتے ہیں تو راستہ بھول جاتے ہیں؟"
اُری اللیلَ یجلوہ النھارُ ولا اُری	"میں دیکھتا ہوں کہ دن رات کو دُور کر دیتا ہے مگر رسوائی
جلالَ المخازی عن تمیمٍ تجلّتِ	کے جُل جو تمیم پر پڑے ہوئے ہیں وہ مجھے کسی حال میں دُور
ولو انّ برغوثاً علی ظھرِ قملۃٍ	ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ اگر لڑائی کے دن تمیم ایک
رأتہ تمیمٌ یومَ زحفٍ تولّتِ	پسّو کو جُوں پر سوار دیکھ لیتے ہیں تو میدانِ جنگ سے
ولو جمعت یوماً تمیمٌ جموعھا	بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر بنو تمیم اپنی فوجیں ایک جکڑی
علی ذرّۃٍ معقولۃٍ لاستقلّتِ	ہوئی چیونٹی سے جنگ کرنے کیلیے جمع کریں تو بھی بھاگ جائیں!"

اس کی ہجوؤں سے قطع نظر کریں تو اس کی بعض مذہبی نظموں میں جوش اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں اس کا کلام اس کے مدِّ مقابل فرزدق کے کلام سے بالکل مختلف ہے۔ طرتاح کہتا ہے :-

"اگر مجھے ایسی کامیابی حاصل نہ ہوئی جس سے مجھے دوزخ سے نجات ملے تو یقیناً میں غیر منقطع بدبختی میں مبتلا ہوگیا۔

دوزخ کے خوف سے کوئی شخص نجات حاصل نہیں کر سکتا، سوا اُس کے جس نے ایک مخلص جاں فروش شخص کی قلبی کیفیت کے ساتھ بندگی کو اپنے

لیے لازم کرلیا ہو۔ یا سوا اس کے جسے اس کے پیدا کرنے والے نے پیدائش سے بھی پہلے خوش بختی عطا کردی ہو۔"

ذیل کے حکیمانہ اشعار بھی اسی کی طرف منسوب ہیں:۔

اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ فَانْهَهَا عَنْ غَيِّهَا	"اپنی ذات سے ابتدا کرو اور اس کو گمراہی سے روکو،
فَاِذَا انْتَهَتْ عَنْهُ فَاَنْتَ حَكِيمُ	اگر تمہیں اس میں کامیابی ہو گئی تو تم حکیم کہلانے کے مستحق ہو گئے"
فَهُنَاكَ تُعْذَرُ اِنْ وَعَظْتَ وَيُقْتَدَى	"اس کے بعد اگر تم کسی کو نصیحت کرو تو مناسب ہے،
بِالْقَوْلِ مِنْكَ وَيُقْبَلُ التَّعْلِيمُ	لوگ تمہاری بات کی پیروی کریں گے اور تمہاری تعلیم قبول کی جائے گی"

طِرِمّاح کا زمانہ شدید عصبیّت کا زمانہ تھا۔ شمالی اور جنوبی عربوں کی کشمکش کا زمانہ تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طِرِمّاح کی ہجو گوئی فرزدق اور دوسرے شمالی عربوں کے لیے وقف تھی اور اس کی مدح جنوبی عربوں کے لیے خاص تھی۔ اس کے مدحیہ قصائد یا قطعات یزید بن مہلّب مخلّد بن مہلّب اور خالد القسری کی تعریف میں ہیں۔ یہ سب امیر جنوبی عربوں میں سے تھے۔

علاوہ مدح و ہجا کے طِرِمّاح کے مُوقلم نے مناظر قدرت کی بعض خوبصورت تصویریں بھی کھینچی ہیں۔ ایک پہاڑی پر اس کو ایک ہرن نظر آتا ہے، جس کی پشت سفید ہے اور ٹانگیں سیاہ، اس کی نسبت وہ کہتا ہے:۔

"وہ سامنے آتا ہے اور پھر نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے،
جیسے بلندی پر کوئی تلوار سونتتا ہو، پھر میان میں کر لیتا ہو!"

اس کا ایک اور شعر ہے:۔

اماحٌ الأهلُ مِن سبيلٍ الى نجدٍ	"اے ہمراہی! کیا نجد کی طرف جانے کی کوئی سبیل ہے؟ اور
ورِيحِ الخُزامَى غَضَّةٍ مِن ثرى جَعْدِ	نجد کی سیراب زمین کے ہلکتے ہوئے لیونڈر کے پودوں
	کی مہک تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہے؟"

---

(۲) جریر

یوں تو عربی شاعری کو عصرِ جاہلی ہی میں بہت اہمیّت حاصل ہو چکی تھی، لیکن جو ترقی اور وسعت اُسے دَورِ اُموی میں حاصل ہوئی اور حکومت کی سرپرستی جس قدر اس دَور میں اُسے میسّر آئی اس کی نظیر ادبِ عربی کی تاریخ کے کسی اور دَور میں کم ہی ملے گی۔

اس کے کئی سبب تھے۔ بنی امیہؓ کی سیاست متقاضی تھی کہ بعض قبائلِ عرب سے بعض دیگر قبائل کے خلاف امداد حاصل کی جائے اور وہ عصبیّت جسے اسلام نے بھلا دیا تھا اسے سیاسی اغراض کے لیے پھر سے زندہ کیا جائے۔ چنانچہ عربی عصبیت اور بداوت نے اس عہد میں پھر سے زور پکڑ لیا اور یہ صورت خصوصیّت کے ساتھ بصرے اور کوفے اور شام کی نئی اسلامی بستیوں میں نمایاں ہوئی، جہاں کے باشندے خالص بدوی تھے۔ بنو امیہؓ اور آلِ زبیر اور خوارج کی باہمی خصومت کی وجہ سے بنو امیہؓ اور ان کے امراء کے درباروں میں مختلف قبائل کے شعراء کو نفوذ اور تقرّب حاصل ہوا۔ اس تقرّب جوئی کے لیے کئی محرّکات کارفرما تھے۔ مثلاً وظائف کا لالچ، وظائف کے بند ہونے کا خوف، ملوک کے خوش ہو جانے پر انعاماتِ مزیدہ کی اُمید، وغیرہ وغیرہ۔

مگر سیاسی اغراض سے قطعِ نظر کریں تو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ بنو امیّہ کو عربی زبان سے شغف اور اس کے ادب کے اِحیار کی طرف شدید رغبت تھی۔ ادب کی کتابوں میں ایسے کئی قصّے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی شعر کے معنی دریافت کرنے یا کسی شعر کے مصنّف کا نام پوچھنے کے لیے یہ خلفاء شاعر یا راوی یا ادیب کو ڈاک کے گھوڑوں پر عراق سے شام بُلوا منگواتے تھے۔

خلفاء اور ان کے امرار کے اس ادبی ذوق کا اثر ان کی رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ اس زمانے کی مجالس میں اکثر یہ چرچے رہتے تھے کہ جاہلیّت اور اسلام کے شعراء میں سے کونسا افضل ہے۔ معاصر شعراء میں سے فلاں بہتر ہے یا فلاں ۔ فخر یا غزل، مدح یا ہجو میں بہترین بیت اور بہترین مصرع کون سا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بصرہ اور کوفہ (خصوصاً بصرہ) جو جدید عربی زندگی کے مرکز اور بادیہ عرب سے قریب تھے۔ اس عام ادبی ذوق کے بھی مرکز تھے۔ بصرے کے نواح میں ایک بازار تھا جسے مربد کہتے تھے۔ یہ مربد دَورِ اُموی میں وہی حیثیت رکھتا تھا جو عُکاظ دَورِ جاہلیت میں۔ اس میں شعرخوانی اور مفاخرت کے حلقے اور علم و ادب کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں اور شاعر اپنے راویوں کو لے کر شعرخوانی اور محاکمے کے لیے مربد کا رُخ کیا کرتے تھے۔ دَورِ اُموی کے ممیّزاتِ ادب میں شاعروں کی مہاجاۃ یعنی باہم ہجوگوئی بھی شامل ہے۔ اس مہاجات کا سبب کچھ تو سیاسی تھا، کچھ ادبی۔ حکومت کی حمایت کرنے والے شعراء اس کے مخالفوں کی ہجو کرتے تھے۔ حکومت انہیں مالی امداد دیتی تھی۔ جس طرح جنگِ عظیم کے زمانے میں موافق پرچوں کو حکومتیں امداد دیتی تھیں۔ شاعر جو کچھ کہتے تھے، لوگوں کو حفظ ہو جاتا تھا اور اس کی نشر و اشاعت خود بخود ہوتی رہتی تھی۔ ایسی سرعت کے ساتھ کہ اس زمانے کے محدود وسائل

آمد و رفت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے۔

ادبی ہجو مفاخرت یا مقابلے پر مبنی تھی، یعنی ایک شاعر دوسرے شاعر کے مقابلے میں اپنی قدرتِ کلام کا مظاہرہ کرتا تھا۔

اُموی دَور میں جس شاعر نے سب کے دلوں میں اپنی ہجو گوئی کا سکّہ بٹھایا، وہ جریر بن عطیہؔ بن حُذیفہ (حذیفہ کا لقب خطفیٰ تھا) ہے۔ آئیے آپ کو اس کا کچھ حال سنائیں۔

جریر لغت میں اونٹ کے گلے کے چرمی رسّے کا نام ہے۔ کہتے ہیں کہ جریر کی ماں نے ایامِ حمل میں خواب دیکھا کہ اس نے کالے بالوں کا بٹا ہوا رسّا جنا۔ اس رسّے نے پیدا ہوتے ہی اُچھل کر کبھی اِس کا گلا گھونٹا، کبھی اُس کا اور یہی سلوک اس نے بہت سے لوگوں سے کیا۔ معبّر نے اُسے بتایا کہ تم ایک شاعر جنوگی جو شریر اور سرکش ہوگا اور لوگوں کو بلا بن کر چمٹا کرے گا۔ جب جریر پیدا ہوا تو ماں نے اس کا نام اسی خواب کی مناسبت سے جریر رکھا۔ جریر کا باپ عطیہؔ کم خرد، سبک عقل اور بخیل تھا۔ جریر فخر سے کہا کرتا تھا "میرے جیسا شاعر کون ہے، جس نے ایسے باپ کے باوجود اسّی شاعروں سے مفاخرت اور منافرت کرکے اُنھیں نیچا دکھایا!"

جریر حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں پیدا ہوا۔ وہ ستوانسا تھا اور اس کے دو بھائی اور بھی تھے۔ ماں باپ دونوں قبیلۂ تمیم کی شاخ بنو کُلیب بن یربوع سے تھے۔ بنو یربوع جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی حصّے میں آباد تھے اور یمامہ سے دریائے فرات کے نیچے تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ باقی تمیم کی طرح صحرانشین تھے اور شاعری، فصاحتِ کلام کے لیے مشہور۔ سجاح متنبّۃ اِنھیں میں سے تھی اور مشہور شعراء مثلاً مالک بن نُویرۃ اور اس کا بھائی متمّم اور سُحیم بن وثیل اور حارثہ غُدانی، بنو یربوع ہی نے پیدا کیے۔

جریر کی تربیت بادیہ ہی میں ہوئی اور غالباً اس نے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا۔ اغانی اور دوسری کتابوں میں جا بجا اس کے شعر املا کرانے کا ذکر آتا ہے، نہ کہ خود لکھنے کا، بہر حال اُس نے بعہدِ جوانی ہی شعر گوئی میں نام پیدا کیا اور امیر معاویہؓ کے عہد میں، یعنی ۴۰ھ اور ۶۰ھ کے درمیان اس کی شہرت اسے دمشق لے گئی اور وہ یزید بن معاویہ کے پاس آتا جاتا رہا، خصوصاً اس کی تخت نشینی کے بعد، یعنی ۶۰ھ اور ۶۴ھ کے درمیان یزید کے مرنے کے بعد ۶۴ھ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جریر کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

شروع شروع میں تو جریر کی ٹکر اوسط درجے کے شعراء سے ہوتی رہی، مگر ۶۴ھ میں جب جریر اور بعیث مجاشعی میں جھڑپ ہو رہی تھی، فرزدق کو کہ وہ بنو مجاشع کا نامور شاعر تھا، بعیث کی طرف داری کرنا پڑی۔ بعیث کی خاطر نہیں، بلکہ اپنے اُن عزیزوں کی رائے عام سے مجبور ہو کر، جن پر جریر نے حملہ کیا تھا۔ فرزدق کا قبیلہ بنو مجاشع اور جریر کا قبیلہ بنو کلیب دونوں بنو تمیم میں سے تھے۔ مگر باوجود ایک دوسرے کے ابن العم ہونے کے جریر و فرزدق شدید مہاجات میں اُلجھ گئے اور شدتِ ہجو میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مصروف ہو گئے اور اپنی باقی ساری عمر یعنی قریب چالیس برس تک اسی منافضت کے جنجال میں پھنسے رہے اور مر کر ہی اس سے چھوٹے۔ ان کے مناقضات یعنی ہجویہ قصائد کا مجموعہ جس میں ۱۳۰ قصیدے شامل ہیں اور جو ابو عبیدۃ کی شرح کے ساتھ بڑی تقطیع کے گیارہ سو صفحوں پر ختم ہوا ہے، لائڈن میں چھپ چکا ہے۔

۷۵ھ میں حجاج عراق کا والی مقرر ہوا اور ۹۵ھ تک اس عہدے پر رہا۔ جریر اس کے دربار میں پہنچا اور اس کی مدح کی۔ حجاج جریر کی بلاغت اور زورِ کلام سے اس قدر متاثر ہوا کہ چاہا، جریر کو خلیفہ عبد الملک کے دربار میں دمشق بھیجا جائے۔ گو خلیفہ اُس زمانے میں شعرائے مُضر سے

جو آلِ زبیر کے مدّاح تھے، بہت خفا تھا، لیکن چونکہ طالبانِ خلافت کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اور بقولِ حماسی ؎

"لوگ جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ ہر جزیرے میں ایک امیر المؤمنین اور منبر موجود تھا۔"

شعر کا بازار گرم ہو گیا تھا اور دربار میں شعراء کی بہت قدر تھی۔ جریر جیسا آتش بیان شاعر موافقوں میں اتّحادِ کلمہ اور مخالفوں میں تفریق و انتشار پیدا کر سکتا تھا۔ حجّاج نے اسے عبد الملک کے دربار میں بھیج ہی دیا۔ عبد الملک نے پہلے تو اس سے اعراض کیا۔ مگر جب جریر ایک دفعہ حاضر ہونے کی جسأت کر بیٹھا، تو خشمگیں ہو کر خلیفہ نے کہا:۔

"تم نے حجّاج کی مدح میں جس افراط سے کام لیا ہے، اس کے بعد ہمارے لیے کیا کہو گے؟"

لیکن جریر نے اس پر بھی کوشش جاری رکھی اور بالآخر محمد بن الحجّاج کی سفارش پر اجازت پا کر وہ قصیدہ پڑھا، جس میں وہ کہتا ہے:۔

الستم خیرَ من رَکِبَ المطایا ؛ واندی العالمینَ بطونَ راحِ

"کیا تم اونٹنیوں پر سوار ہونے والوں میں سب سے بہتر ــــ اور ــــ جہان بھر کے لوگوں سے زیادہ سخی نہیں ہو!"

اس پر عبد الملک مسکرایا اور کہا:۔ "ہم ایسے ہی ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی رہے ہیں"۔ قصیدہ ختم ہوا تو جریر کو سو دودھیل اونٹنیاں اور آٹھ شتربان انعام میں ملے۔ اس کے بعد وہ دربار میں آنے جانے لگا۔ چار ہزار درہم، سواری اور لباس اس کا انعام مقرر ہو گیا۔ دمشق کے دربار میں اس کا مقابلہ اُمویوں کے مشہور شاعر اخطل تغلبی اور عدی بن الرقاع سے ہو گیا۔ نقائض جریر والفرزدق

کی طرح نقائض جریر و اخطل بھی چھپ چکے ہیں۔

۸۶ھ میں عبدالملک کے فوت ہونے پر جریر اس کے جانشینوں کے دربار میں بھی حاضر ہوتا اور سوا خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے سب سے مقررہ انعام لیتا رہا۔ اس کے دیوان میں جو قاہرہ میں چھپا ہے۔ یزید ثانی اور ہشام کی مدح میں بھی قصائد موجود ہیں۔ اس حساب سے وہ بنی اُمیّہ کے آٹھ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتا رہا۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ یمامہ میں فوت ہوا۔ وفات کا سال ۱۱۰ یا ۱۱۴ھ تھا اور اس نے اسّی سال سے زیادہ عمر پائی۔ فرزدق جو عمر میں اس سے بڑا تھا ایک سال پہلے فوت ہوا۔ یمامہ سے شمال مغرب میں وشم کے علاقے میں اُثیفیہ ایک گاؤں تھا، جس میں جریر کی جائداد تھی اور جہاں وہ رہا بھی کرتا تھا۔ اس کی اولاد اس بستی کے اکثر حصّے کی مالک تھی اور یہ سلسلہ چند پشتوں تک جاری رہا۔ جریر کے آٹھ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ اس کی اولاد میں بھی کئی پشتوں تک شاعری باقی رہی۔

جریر کا شمار نامور شعرائے اسلام میں ہے۔ اس کی تشبیبیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اس کے کلام میں متعدد رقت پیدا کرنے والے مرثیے موجود ہیں۔ فخر اور مدح میں بھی وہ بہت کامیاب تھا۔ اور ہجوگوئی میں تو اس کے کمال کے سب معترف ہیں۔

علمائے شعر کہتے ہیں کہ جریر کے شعر میں زمانۂ جاہلیّت کی بلاغت محفوظ ہے۔ بعد میں جو خارجی اثرات عربی ادب پر پڑے، جریر کا کلام ان سے بچا ہوا ہے اور اسلوب قرآن مجید و حدیث کے زیر اثر ترکیب غریب اور کلام وحشی سے پاک ہے۔ زبان کی خوبی کے علاوہ نقائض میں جریر نے اپنی قوم بنو کلیب کے مآثر و مفاخر اور ان کے ایّام کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ بات ان کے ہم جنس قبائل کو حاصل نہ ہوتی، گو وہ بھی خاصی اہمیت رکھتے تھے۔

سب کو اتفاق ہے کہ جریر و فرزدق و اخطل اسلامی زمانے کے تمام شعراء پر مقدم ہیں۔

مگر اس پر اتفاق نہیں ہے کہ ان میں سے افضل کون ہے۔ ان کے زمانے میں بار بار مجالس و محافل میں، بلکہ بعض دفعہ میدانِ جنگ میں بھی یہ سوال زیرِ بحث آتا تھا کہ ان تینوں میں سے افضل کون ہے؛ جریریوں اور فرزدقیوں کی مخالف و موافق رایوں سے کتابوں کے صفحے کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔

ہجو میں جریر کو جو قدرت حاصل تھی۔ اس کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں۔ جب اس نے بصرے میں الراعی شاعر سے خفا ہو کر اس کے قبیلے بنو نُمیر کی ہجو میں اسّی اشعار کا قصیدہ کہا تو الراعی کے لیے بصرے میں ٹھہرے رہنا نا ممکن ہو گیا۔ وہ اسی وقت اپنے تمام آدمیوں کو لے کر شہر سے ایسا بھاگا کہ اپنے اصلی وطن نجد ہی میں جا کر دم لیا۔ الراعی کا علفی بیان ہے کہ جب وہ وطن پہنچا تو ہجوِ مذکور کا شعر

فغضّ الطرفَ اِنّکَ مِن نُمیرٍ ؛ فلا کعباً بلغتَ و لا کِلابا

اس سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ الراعی کو یقین تھا کہ جریر کے معاون جنّوں میں سے بھی تھے۔ انھوں نے یہ شعر اس کے وطن میں پہنچایا۔ صدیوں تک اس شعر کی وجہ سے بنو نُمیر ذلّت و عار میں ڈوبے رہے۔

اب جریر کے کلام کے چند اور نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ باپ دادا سے ناراض ہو کر اُس نے کہا ؎

وانّی لمغرورٌ اُعلّلُ بالمُنیٰ	"میں نے دھوکا کھایا، جب میں نے اپنے دل کو اس
لیالیَ ارجو انّ مالکَ مالیا	آرزو سے بہلایا کہ آپ کا مال میرا مال ہے۔
بایّ سِنانٍ تطعنُ القومَ بعدما	جب آپ نے اپنے نیزے کی نیز آنی کو نکال کر پھینک دیا تو
نزعتَ سِنانًا مِن قناتِکَ ماضیا	اس کے بعد وہ کونسی انی ہے جس کے ساتھ آپ دشمن سے لڑیں گے؟
بایّ نِجادٍ تحملُ السیفَ بعدَ ما	جب حمائلِ شمشیر کی باقی ماندہ لڑیاں آپ نے کاٹ دیں
قطعتَ القُویٰ من مِحمَلٍ کانَ باقیا	تو وہ کونسی حمائلِ شمشیر ہے جس سے آپ تلوار باندھیں گے۔

بیوی کا مرثیہ:-

لولا الحیاءُ لعادنی استعبارُ	اگر حیا مانع نہ ہوتی تو میں ضرور گریہ وزاری کرتا۔
ولزرتُ قبرکِ والحبیبُ یُزارُ	اور تمہاری قبر کی زیارت کرتا، اور محبوب کی زیارت کیا ہی کرتے ہیں
ولہتِ قلبی اذ علتنی کبرۃٌ	تم نے میرے دل کو غم سے بیخود کر دیا۔ اس وقت جبکہ بڑھاپے
وذو التمائمِ من بنیکِ صغارُ	نے مجھ پر قابو پا لیا اور تمہارے بچے تعویذ پہنے ہوئے ہیں یعنی
لا یلبثُ الاحبابُ ان یتفرقوا	ابھی بالکل خرد سال ہیں۔ شب و روز جو احباب کے پے در پے
لیلٌ یکرُّ علیہم و نہارُ	حملے کرتے رہتے ہیں، ان کو بے درنگ بے توقف ایک دوسرے
صلّی الملائکۃُ الذین تخیّروا	سے جدا کر دیتے ہیں ـــ برگزیدہ فرشتوں اور پاک اور
والطیبونَ علیکِ والابرارُ	نیک لوگوں کا تم پر درود و سلام ہو۔
فلقد اراکِ کُسیتِ احسنَ منظرٍ	میں دیکھتا ہوں کہ تم کو نہ صرف خوش منظری کا لباس عطا ہوا تھا،
ومع الجمالِ سکینۃٌ ووقارُ	بلکہ جمال کے ساتھ تم میں آہستگی اور وقار بھی تھا۔"

فرزدق کی ہجو:-

زعم الفرزدقُ اَن سیَقتُلُ مِربعاً	فرزدق کہتا ہے کہ وہ عنقریب مربع کو قتل کر دے گا
اَبشِر بطولِ سلامۃٍ یا مِربعُ	اے مربع تم کو دیر تک سلامت رہنا مبارک ہو!

الراعی کی ہجو:-

اذا غضبتْ علیکَ بنو تمیم	اگر بنو تمیم تم پر خشمگیں ہو جائیں،
حسِبتَ النّاسَ کلّھم غضابا	تو تم کو یوں معلوم ہوگا کہ سارا جہان تم پر خشمگیں ہے۔
فغُضّ الطرفَ انّکَ مِن نُمیرٍ	نیچے دیکھو، اس لیے کہ تم نمیری ہو
فلا کعباً بلغتَ ولا کِلابا	نہ تم بنو کعب کی برابری کر سکتے ہو، نہ بنو کلاب کی!

(کعب و کلاب اور نُمیر تینوں عامر بن صعصعہ کی شاخیں تھیں۔ جریر نمیریوں کو طعنہ دیتا ہے کہ تم اپنے بھائی بندوں سے کم پایہ ہو اور ان کو تم پر ترجیح ہے!)

---

(۲) ابو العتاہیہ

خلافتِ عبّاسیہ ایک انقلابی تحریک کے کامیاب ہوجانے پر وجود میں آئی۔ نئی سلطنت خراسانیوں کی امداد سے قائم ہوئی۔ اکاسرہ کے سرمائی پایۂ تخت مدائن سے قریب بغداد آباد ہوا اور نئی خلافت کا مرکز بنا۔ بنو امیّہ کے عہد میں حکومت عربی تھی۔ اس کے ارکان امراءِ عرب اور اس کی فوجی طاقت عربی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کی رُوح خالص عربی روح تھی۔ بنو عبّاس کے عہد میں حکومت تو بدستور عربی تھی، مگر اس کے اکثر ارکان، امراءِ عجم تھے اور اس کی فوجی طاقت کا مدار بھی بیشتر عجمیوں پر تھا۔ لہٰذا اس زمانے کی رُوح پر عجمیّت کا غلبہ تھا۔ چنانچہ عبّاسی حکومت کے دورِ اوّل میں بداوت کے بجائے حضارت کا زور ہوا۔ بادیہ نشین شہروں میں آ کر بس گئے۔ خیموں کی جگہ محلات نے لے لی۔ بادیہ نشین اب شہری تکلّفات، فرش فروش، قالینوں، پردوں، حوضوں اور باغات کے خوگر ہو گئے اور شہریوں کے اخلاق و شعور ان میں پیدا ہونے لگے۔ اموال کی کثرت، صنائع و حرف کی ترقی اور عرب و عجم کی آمیزش سے نئے دور میں سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ اجتماعی انقلاب بھی پیدا ہوا۔ طبائع کو عیش پرستی اور راگ رنگ کی طرف بیش از بیش رغبت ہوئی۔ ان انقلابات نے شعر میں بھی انقلاب پیدا کیا، کیونکہ شعر کسی قوم کے اخلاق و آداب و احوال ہی

کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

جہاں دورِ اُموی میں اکثر شعراء بادیہ نشین عرب تھے۔ دورِ عباسی میں وہ زیادہ تر غیر عرب شہری تھے۔ جن کے شعر میں نظامِ اجتماعی کا انقلاب منعکس ہو رہا تھا۔ اُموی شعراء کو حکومت کی سیاسی اغراض کے تحت قبائلی عصبیتوں کے جھگڑوں میں اُلجھنا لازمی تھا۔ اب وہ سیاست ختم ہو گئی۔ اب خلفاء اور امراء شعر کی طرف اس لیے متوجہ ہوتے تھے کہ شعر سے ادبی لذت حاصل کریں، یا اپنی مدح سُنیں۔ جاہلی قصیدے کا آغاز دیارِ محبوب اور اطلال اور اونٹوں کے ذکر سے ہوا کرتا تھا۔ اب اس طریقے پر تنقید ہونے لگی۔ منجملہ اوروں کے ابو نُواس نے کہا ؎

صِفَۃُ الطُّلُوْلِ بلاغۃُ القِدَمِ ÷ فَاجْعَلْ صفاتکَ لِابْنَۃِ الکَرَمِ

"کھنڈروں کے حال کا بیان قدماء کی بلاغت تھی، تم اپنے بیان کو دخترِ رز کے حال کے بیان تک محدود کر دو۔"

طرزِ بیان کے علاوہ معانیِ شعر میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ علومِ عجم کے تراجم شعراء کے مطالعے میں آئے تو معانیِ جدیدہ بھی شعر میں داخل ہوئے۔ بعض لوگ جب جدید حقائقِ علمیہ سے متأثر ہو کر تشکک کی طرف مائل ہوئے تو شعرائے عہد بھی تشکک اور دغدغے سے خالی نہ رہ سکے۔ نہ صرف فلسفی خیالات بلکہ فلسفی تعبیرات اور الفاظ و تراکیب بھی شعر میں استعمال ہونے لگیں۔ یوں تو مدح کا رواج عہدِ بنو اُمیّہ میں بھی تھا۔ مگر بنی عباس کے دور میں مدح اور مبالغہ آمیز مدح کا رواج بہت زیادہ ہو گیا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ مطلق العنانی کے بڑھ جانے سے حُکّام کو چاپلوسی زیادہ مرغوب ہو گئی ـــــ کچھ ایرانی اثرات بڑھ گئے تھے اور کچھ گراں سنگ انعامات کے لالچ نے شعراء میں تملّق پیدا کر دیا تھا۔

ان خصوصیتوں کے علاوہ بعض امرا کی عیش پسندی نے ان کے حاشیہ نشین شعرا کی توجہ وصفِ خمر، وصفِ جواری و غلمان اور مجون (یعنی شوخ چشمی اور بے باکی) پر بھی مرتکز کر دی تھی۔

اس انقلابی ماحول میں ایک شاعر نمودار ہوا، جس نے انقلاب کے اندر انقلاب پیدا کر دیا۔ جس نے اپنے معصروں کے ہلاکت آفریں ذوق سے روگردانی کی اور لفظ اور معنی کے لحاظ سے شعر میں انقلاب پیدا کیا۔ یہ شاعر ابو العتاہیہ ہے۔ جو ادبِ عربی کا پہلا فلسفی شاعر ہے اور جو سادگیِ زبان کے اعتبار سے ادبِ عربی میں نظیر نہیں رکھتا۔

ابو العتاہیہ لقب ہے، اسمٰعیل بن قاسم ابو اسحاق کا۔ اس کا پردادا کیان موالیِ بنو عنزہ میں سے تھا اور عین التمر میں رہتا تھا۔ جو ہئیت کے جنوب میں بادیہ کی ایک بستی تھی۔ اور اب ناپید ہے[1]۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اسلامی فتوحات ہوئیں، تو کیان گرفتار ہو کر دربارِ خلافت میں پہنچا اور ایک عنزی نے اسے چھڑوا دیا۔ یوں کیان بنو عنزہ کا مولی بن گیا۔ ابنِ خلّکان نے لکھا ہے کہ ابو العتاہیہ عین التمر میں پیدا ہوا۔ اس لیے وفیات میں اس کی نسبتیں عنزی اور عینی دونوں دی ہیں۔ ابو العتاہیہ کا سالِ پیدائش ۱۳۰ھ ہے، یعنی بنو امیہ کے خاتمے سے دو سال پہلے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بچپن ہی میں اس کا خاندان مذار میں منتقل ہو گیا، جو علاقۂ میسان کا صدر مقام تھا۔ مذار بصرے کے شمال میں چارین کی راہ پر واقع تھا۔

پیشے کے لحاظ سے ابو العتاہیہ کا باپ حجّام تھا۔ یعنی سینگیاں لگانے کا کام کرتا تھا ابو العتاہیہ نے بھی اپنی زندگی کے ایک حصے میں یہ پیشہ اختیار کیے رکھا۔ یہ بھی روایت ہے

---

[1] دیکھیے لیسٹرنج، لینڈز آف دی ایسٹرن کیلیفیٹ، ص ۶۵۔

کہ "صاحب الزّنادقہ" اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا اور اس لیے ڈر کے مارے اس نے یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ ابو العتاہیہ کا بھائی زید خَنتم یعنی سبز روغنی سبو، یا مرتبان بناتا تھا۔ ان کی اپنی بھٹی تھی۔ جس میں حبشی غلام برتن بناتے تھے اور کوفے میں ان کا ایجنٹ یہ برتن فروخت کرتا تھا۔

بچپن ہی سے ابو العتاہیہ شعر کہنے لگا۔ اس نے اتنی مشق بہم پہنچائی تھی کہ بقول اُس کے، اگر وہ چاہتا تو اپنی ہر بات شعر میں کہہ سکتا تھا۔ ظروف سازی کے زمانے میں طالب علم اور نوجوان اُس کے پاس آتے، اُس کے اشعار سُنتے اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑوں پر لکھ لیتے۔ یہاں سے وہ اپنے مَداری ہم وطن ابراہیم موصلی کے ساتھ بغداد پہنچا، مگر اُس وقت وہ بغداد کو اپنی طرف متوجّہ نہ کر سکا اور حیرہ میں مقیم ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب شاعری میں اس کا نام مشہور ہوا تو پھر بغداد کا رُخ کیا۔ قصرِ خلافت کے خادموں اور لونڈیوں سے واقفیت پیدا کی اور عُتبہ نام ایک لونڈی پر فریفتہ ہو گیا۔ یہ لونڈی خلیفہ مہدی کی تھی۔ لونڈی نے ابو العتاہیہ کی طرف مطلق توجّہ نہ کی۔ اس پر ابو العتاہیہ کو اس قدر مایوسی ہوئی کہ اس کے خیالات نے پلٹا کھایا۔

اس وقت بغداد میں مختلف قوموں کے لوگ آباد تھے اور یونان، فارس اور ہند کے علوم عربی میں منتقل ہو رہے تھے اور ایک اہم حرکتِ فکری پیدا ہو رہی تھی۔ اسی سے متاثر ہو کر ابو العتاہیہ نے بھی متکلمین اور شیعہ اور جبریہ اور زہّاد کے مذاہب کا مطالعہ کیا۔ ایک مدّت تک وہ پہلے ان میں سے ایک مذہب کا پیرو بن جاتا۔ پھر دوسرے کی طرف رجوع کرتا۔ آخر ان سب کو ملا کر اس نے اپنے لیے ایک عقیدہ وضع کیا جو عبادت اور زہد قولی و فعلی پر مبنی تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ امورِ دنیا سے رُوگردانی کا وعظ کہنے پر بھی اسے مال سے مفرط محبت تھی اور وہ بخیل بھی تھا۔

الصوّلی نے ابو العتاہیہ کا مذہب یوں بیان کیا ہے :۔

"ابو العتاہیہ توحید کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک خدا نے دو متضاد جوہر عدم سے پیدا کیے اور ان سے دُنیا کی وہ شکل بنائی جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ دُنیا اصل اور بناوٹ دونوں کے اعتبار سے حادث ہے۔ اس کا مُحدِث خدا ہے۔ جو اعیان کے فنا ہونے سے پہلے اسے دوبارہ متضاد جوہروں میں پلٹ دے گا۔ علم اشیاء فکر، استدلال و بحث کے اندازے کے مطابق طبعی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ وہ وعید اور تحریم مکاسب (یعنی دنیا کے دھندوں میں نہ پڑنے) کا قائل اور زیدیوں کے بَترِیَّہ فرقے کا متبع تھا۔ کسی کی بُرائی نہ کرتا تھا اور حکومت کے خلاف خروج کا قائل نہ تھا۔"

ان میں سے بعض عقائد مثلاً دو جوہروں کا عقیدہ اور تحریم مکاسب کا عقیدہ مانوی رنگ رکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے متعدّد معاصر اس کو زندیق تصوّر کرتے تھے (اس زمانے میں مانویہ کو زندیق کہتے تھے) لیکن اس کے دشمنوں کا یہ الزام کہ وہ بعث و نشور اور جنّت و نار کا قائل نہ تھا، بے بنیاد تھا، دیوان میں متعدّد اشعار سے ثابت ہے کہ وہ ان سب باتوں کا قائل تھا۔ مثلاً وہ کہتا ہے :۔

"اگر ہولِ موت کے بعد اور کوئی بات نہ ہوتی تو معاملہ آسان تھا اور اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مگر حشر و نشر ہے، جنّت و نار اور وہ باتیں جن کی اطلاع طویل ہے۔"

جب ابو العتاہیہ کی شاعری کی شہرت خلیفہ مہدی تک پہنچی تو اسے دربار میں بلایا گیا اور وہ درباری شعراء میں شامل کر لیا گیا۔ ایک مرتبہ بشّارِ (اعمٰی) اور اشجعِ سُلَمیؔ حاضر تھے اور

ابو العتاہیہ بھی حاضر تھا، جس کی عمر اس وقت چالیس سال سے کم تھی۔ بشار نے اس کے قصیدے کی تشبیب سُنی تو اشجع سے کہا:-

"کتنی کمزور تشبیب ہے اور اس پر جرأت ملاحظہ ہو کہ مشبّب بہا خلیفہ کی لونڈی ہے اور خلیفہ سُن رہا ہے!"

اتنے میں ابو العتاہیہ اِن شعروں پر پہنچا:-

اَتَتْه الخلافة منقادةً؛ اليه تجرّر اذيالها ❊ فلم يك تصلح إلّا له ولم يك يصلح إلّا لها
ولو رامها احدٌ غيرهٗ لزلزلت الارضُ زلزالها ❊ ولو لم تُطِعه بنات القلوب لما قبّل اللّٰه اعمالها
وانّ الخليفة مِن بُغض لا اليه ليبغض من قالها

"خلافت مطیع ہو کر اس کی طرف (ناز نخرے سے) دامن کشاں آئی۔ خلافت سوا اس کے اور کے لیے زیبا بھی نہ تھی اور نہ خلیفہ اس کے سوا اور کے لیے زیبا تھا۔ اس کے سوا کوئی اور اگر خلافت کا قصد کرتا تو زمین میں زلزلۂ عظیم برپا ہو جاتا۔ اگر دلوں کے اجزاء اس کی اطاعت نہ کرتے، تو اللہ ان کے عملوں کو قبول نہ کرتا۔ کلمۂ لا کے بُغض کی وجہ سے خلیفہ اس کلمے کو منہ سے نکالنے والے سے بُغض رکھتا ہے!"

بشّار شعر سُن کر جھومنے لگا اور اشجع سے کہنے لگا:- "ارے میاں دیکھنا! اس کوفی کے شعر سُن کر خلیفہ فرطِ طرب سے فرش سے اُڑ تو نہیں گیا؟"

خلیفہ مہدی کے دربار میں ابو العتاہیہ کا تقرّب کچھ عرصے تک جاری رہا، مگر کسی وجہ سے ناراض ہو کر خلیفہ نے اسے قید کر دیا۔ گو بعد چندے وہ رہا ہو گیا اور پھر دربار میں آنے جانے لگا، یعنی دربار سے اس کا تعلق بدستور قائم ہو گیا۔

اپنی عمر کے نصف اوّل میں ابو العتاہیہ غزل، مدح، ہجو، ہر قسم کے شعر کہتا تھا، مگر

رشید کی تخت نشینی سے قدرے پہلے اس نے غزل گوئی چھوڑ دی اور صرف زہد کے مضامین پر شعر کہنے لگا۔ ہاں گاہے گاہے خلیفہ اور امراء کی مدح کر کے وہ انعام و اکرام بھی حاصل کر لیتا تھا۔ اس کے بعد رشید ہی کے زمانے میں (۱۸۰ھ ۔ ۱۹۳ھ) اس نے شعر گوئی بالکل ترک کر دی۔ اس پر رشید نے اسے قید کر دیا۔ ناچار اس نے خلیفہ کے حکم کے مطابق پھر شعر کہنا شروع کر دیا اور قید سے آزاد ہوا۔ مگر وہ حسب عادت غزل اور ہجو سے کنارہ کش اور صرف زہدیات پر شعر کہتا رہا۔ رشید، امین اور مامون کے اکثر ایام خلافت گذار کر وہ ۲۱۱ھ میں تقریباً ۸۱ قمری سال عمر پا کر فوت ہوا اور بغداد کے محلہ کرخ کے متصل نہر عیسیٰ کے کنارے پل زیاتین کے مقابل دفن ہوا۔ (زیاتین کے لیے دیکھیے تاریخ بغداد نقشہ ۴ مقابل ص ۷۵، عدد ۲۵)

بشار اور سید حمیری کی طرح ابوالعتاہیہ پرگو شاعر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا پورا کلام محفوظ نہ ہو سکا۔ اس کا ایک دیوان بیروت میں چند بار اور لاہور میں ایک مرتبہ چھپا ہے۔ اس دیوان میں چھ باب ہیں۔ مدح و عتاب، اوصاف و ہجا، امثال و مراثی۔

ابوالعتاہیہ کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ اس کی زبان سادہ اور اس کے معانی عام فہم ہیں۔ مرزبانی نے لکھا ہے کہ وہ عوام الناس میں سے تھا۔ جو ادب اس نے تعلیم سے حاصل کیا اس سے کئی گنا اس کی طبیعت اور قریحت (Genius) کے فیض سے اس کو حاصل ہوا۔ طبیعت کی رقت، مضمون کی سہولت، سلاست زبان، سرعت تالیف، یہ خصائص اس کو حاصل تھے۔ اسی طرح صاحب اغانی نے بھی اس کی آمد کو ایک امنڈتا ہوا دریا قرار دیا ہے اور اس کے معانی کو لطیف، اس کی زبان کو آسان بتایا ہے۔ مگر مرزبانی اور اصبہانی دونوں نے لکھا ہے کہ ان کمالات کے باوجود فاحش غلطیاں اور ردی، کم وزن اور کم پایہ

باتیں اس کے ہاں بہت ہیں۔

زبانِ شعر کے متعلق ابو العتاہیہ نے اپنی رائے ایک معاصر کو یوں بتائی :۔

"شعر فحولِ متقدّمین کی طرز پر لکھنا چاہیے۔ یہ نہ ہو سکے تو شعر کی زبان ایسی ہونی چاہیے کہ عوام اسے سمجھ سکیں، جیسے میرے شعروں کی زبان۔ یہ بات زہدیّات پر خصوصیّت سے عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کہ زہد ملوک، یا راویانِ شعر، یا لغت نویسوں کے مطلب کی چیز تو ہے نہیں، اس کے مشتاق تو زاہد اور اصحابِ حدیث و فقہ اور عوام النّاس ہیں۔ یہ لوگ اُس چیز کو پسند کرتے ہیں، جس کو وہ سمجھ سکیں۔" (دیوان)

یہی خیال اُس نے ایک دفعہ سَلم الخاسر کے سامنے بیان کیا۔ اپنے کچھ اشعار اسے سنائے اور پوچھا کہ کیسے ہیں؟ اُس نے کہا، خوب ہیں، اگر الفاظ سوقیانہ نہ ہوتے۔ ابو العتاہیہ نے کہا، "واللہ! جس بات نے تمھیں کم رغبت کیا، اُسی نے مجھے ان کی طرف راغب کیا۔"

موجودہ دیوان میں عموماً زہدیّات کے مضامین ہیں۔ مثلاً قافیۂ الف کی نظموں کے عنوان اس قسم کے ہیں :۔

وصف طبائع اہل عصر، ذمِ دُنیا، تقوی اللہ، غرورِ دنیا، ایثار الباقیہ علی الفانیہ، قناعت و زُہد، وصفِ موت و سکراتِ موت، عموم الموت، زوالِ دُنیا، علماء کو اختلافِ باہمی پر ملامت، حِکَم و امثال، تقویٰ، توبیخِ خطا کار، اعتذار،

وعلیٰ ہٰذا القیاس وعظ و تذکیر کی طرز پر وہ درجنوں شعر "أین" کے ساتھ لاتا ہے۔ مثلاً :۔

این البرامکۃ الذین عہدتہم ؛ بالامسِ اعظمَ اہلِہا أخطارا

"برمکی کہاں گئے، جن کو کل تک میں نے دُنیا کے بلند ترین لوگوں میں سے پایا۔"

اینَ الاُلیٰ شادوا الحصُون وجنّدوا ؛ فیھا الجُنود تعززاً این الاُلیٰ

"کدھر گئے وہ لوگ، جنھوں نے مضبوط قلعے کھڑے کیے اور ان میں ارجمندی کے حصول کے لیے لشکر بٹھائے ـــ ہاں، وہ کدھر گئے؟"

اِس بیان سے ظاہر ہے کہ ابوالعتاہیہ پر حُزنیّت غالب ہے۔ وہ رجا سے منع کرتا ہے۔ دُنیا کی چیزوں کے ہیچ در ہیچ ہونے کی بنا پر زُہد پر زور دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ "دنیا درد کا پائدار دورہ ہے"۔ ابوالعتاہیہ کے فلسفے میں مسرّت اور شادمانی غائب ہے۔ تاہم وہ یہ سبق ضرور دیتا ہے کہ دُنیا کا بوجھ دلیری اور استقلال سے اٹھانا چاہیے، اس لیے کہ اس سے چارہ نہیں۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح زبان اور معانی کے اعتبار سے ابو العتاہیہ نے ماضی کی روایات سے اپنے آپ کو آزاد کیا۔ عروض کے بندھنوں سے بھی اس نے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کی بعض نظموں کے وزن عروض سے باہر ہیں۔ اس سے پوچھا گیا، تم عروض جانتے ہو؟ اس کا جواب تھا: "انا اکبر من العروض"۔ یعنی "میں عروض سے بزرگ تر ہوں"۔

عربی شاعری میں بہترین شعر وہ ہے کہ جو مستقل اور قائم بالنفس ہو۔ پچھلے، یا اگلے بیت کو ملا کر معنی کو مکمل کرنا "تضمین" کہلاتا ہے جو شدید قسم کا عیب تصوّر ہوتا ہے۔ مگر اس کے ہاں ایسی نظمیں ہیں جن کا ہر شعر اگلے شعر کے ایک حصّے کو ساتھ ملانے سے مکمل ہوتا ہے۔

فارسی کے شعراء

میرزا عبدالقادر بیدلؔ

دسویں صدی ہجری کے ربع آخر اور گیارھویں کے نصف اوّل کا بہترین شاعر فارسی جو ہندوستان نے پیدا کیا، وہ میرزا عبدالقادر بیدلؔ ہے۔ میرزا ۱۰۵۴ھ میں عظیم آباد پٹنے میں پیدا ہوے۔ اُس وقت شاہجہان بادشاہ کے عہدِ حکومت کا نصف ثانی شروع ہو چکا تھا۔ میرزا کے والدِ بزرگوار میرزا عبدالخالق ایک متّقی اور پرہیزگار بزرگ اور مغلوں کے گروہ ارلاس میں سے تھے۔

میرزا کے والد کے ایک دوست مولانا قاسم درویش نے لفظِ "انتخاب" سے ان کی تاریخ ولادت نکالی۔ میرزا کے بڑے بھائی میرزا عبداللہ کا ذکر مجموعۂ نغز میں موجود ہے معلوم نہیں اَور کتنے بھائی تھے۔ میرزا پانچویں برس میں تھے کہ والدِ ماجد کا انتقال ہوا۔ چھٹے برس کے چھٹے ماہ کے آغاز میں والدہ بھی انتقال کر گئیں اور ان کے چچا میرزا قلندر ان کی تربیت کے متکفل ہوے۔ اسی سال کے آخر میں انھوں نے قرآن مجید ختم کیا اور عربی صرف و نحو کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ نشترِ سخن میں ہے کہ دس سال کی عمر میں کافیہ ختم کیا۔ ساتھ ساتھ فارسی نظم و نثر کی تعلیم جاری تھی۔ پھر شرح جامی شروع کی۔ مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد عربی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نشترِ سخن میں اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ میرزا قلندر اُن کے چچا ایک دن

مدرسے میں بیٹھے تھے کہ دو طالب علموں میں مباحثہ شروع ہوا۔ بہت سی قیل و قال کے بعد ایک غالب اور دُوسرا مغلوب ہوا۔ غالب میں غرُور اور مغلوب میں سخت انفعال کے علامات ظاہر ہوئے۔ میرزا قلندر نے دل میں کہا کہ تحصیلِ علم کا اگر یہ حاصل ہے کہ غالب آئیں تو تکبّر پیدا ہو اور مغلوب ہو جائیں تو شرمندگی لاحق ہو تو ایسی تحصیل سے کیا فائدہ؟ غرض اُسی دن سے اُنھوں نے اپنے بھتیجے کو تحصیلِ عربیّت سے روک دیا اور میرزا فقراء کی صحبت میں رہنے لگے۔

میرزا نے جن اساتذہ سے فیض پایا، ان میں سے ایک مولانا کمال تھے۔ جن کا ذکر میرزا نے اپنی کتاب چہار عناصر میں کیا ہے۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالعزیز عزّت سے بھی علمی فیض حاصل کیا۔ بقول سرخوش شیخ عبدالعزیز علمِ معقول و منقول میں سرآمدِ روزگار اور فنونِ سپہ گری اور سلیقۂ شعر و انشاء میں یگانۂ آفاق تھے۔ شاہجہان بادشاہ نے انھیں ہفت صدی منصب اور عرضِ مکرّر کی داروغگی سے سرافراز کیا تھا۔

نشترِ سخن میں ہے کہ میرزا کو علمِ دین، ریاضیات اور علوم طبیعی میں کامل دسترس حاصل تھی اور تصوّف، طبّ، نجوم، رمل، تاریخ اور موسیقی میں بھی پوری مہارت بہم پہنچائی تھی۔ خوش گو نے لکھا ہے کہ میرزا کو پوری مہابھارت حفظ تھی اور فارسی کے علاوہ ترکی بھی خُوب جانتے تھے۔ خان آرزو کہتے ہیں کہ میرزا عبدالقادر علمِ ظاہری سے بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ بزرگوں کی صحبت اور کتبِ صوفیہ کی سیر سے اس قدر استعداد پیدا کر لی تھی کہ تمام سرزمینِ شعر میں تخمِ تصوّف کاشت کیا اور مشربِ توحید سے اس قدر آشنا تھے کہ ان کی ہجو و ہزل بھی ذوقِ درویشانہ سے خالی نہ تھی۔

میرزا کو تصوّف میں تخصّص حاصل تھا۔ ان کا شاگرد مخلص لکھتا ہے، تصوّف میں انھیں غلو تھا اور اسے بہترین علوم سے سمجھتے تھے۔ والہِ داغستانی کہتے ہیں کہ میرزا عارفِ محقق اور

کاملانِ مدقق میں سے تھے۔ مشربِ توحید کی چاشنی ان کے رحیقِ کلام سے ظاہر اور مذاقِ تصوّف کی شیرینی ان کی شکر گفتاری سے ہویدا ہوتی تھی۔ مسئلۂ توحید کی تحقیق میں وہ یگانہ تھے اور ترکِ تجرّد میں سرآمدِ زمانہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ میرزا نے کم عمری ہی میں شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ گلِ رعنا اور نشترِ سخن میں ہے کہ ابتدائی زمانے میں ان کا تخلص رمزی تھا۔ ایک دن گلستانِ سعدی کے دیباچے میں انھوں نے شیخ کا مصرع: "بیدل از بے نشان چہ گوید باز" پڑھا تو بیدل تخلص پسند کر لیا۔

ابتدائے شباب ہی میں میرزا عبدالقادر نے نوکری اختیار کر لی۔ شاہجہان بادشاہ کا دوسرا بیٹا شاہ شجاع ۱۰۵۰ھ سے ۱۰۷۰ھ تک بنگال کا گورنر رہا۔ میرزا اس کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ ۱۰۷۰ھ میں جب شاہ شجاع کو قید کیا گیا، میرزا کی عمر ۱۶ سال کے قریب تھی۔

۱۰۸۸ھ میں سلطان محمد اعظم بن اورنگزیب مخاطب بہ عالی جاہ متخلّص بہ اعظم بنگال کا گورنر مقرر ہوا اور تقریباً تین سال اس عہدے پر فائز رہا۔ میرزا عبدالقادر نے شاہ شجاع کے بعد اس شہزادے کی ملازمت اختیار کی۔ شہزادہ ہنرمند اور ہنر پرور تھا۔ فارسی اور ہندی میں شعر کہتا تھا۔ خوش گو نے اس کے ہندی شعروں کی تعریف کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ شہزادے کو موسیقی میں بھی اچھی دسترس حاصل تھی اور اس کی تصنیفیں مشہور ہیں۔ سلطان محمد اعظم کی سرکار میں میرزا عبدالقادر کو پانصدی منصب ملا۔ وہ کو فتگر خانے کی خدمت پر متعیّن ہوئے اور بیس سال تک شہزادے کی ملازمت میں رہے۔ شہزادے کی ہنر پسندی نے اس کے دربار میں متعدد شعرا جمع کر دیے تھے۔ مرزا بیدل کے علاوہ میر محمد زمان راسخ سرہندی، حاجی محمد سالم کشمیری اور حکیم شیخ حسین شہرت اس دربار کی زینت تھے اور شعر و سخن کے خوب خوب چرچے رہتے تھے۔

اس کے بعد ایک واقعہ پیش آیا۔ جس نے میرزا کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ خزانۂ عامرہ، نشترِ عشق اور تذکرۂ بے نظیر میں ہے کہ میرزا کے کسی آشنا نے شاہزادہ محمد اعظم سے کہا کہ میرزا زبردست شاعر ہے۔ شاہزادے نے کہا کہ اگر میرزا ہماری تعریف میں قصیدہ کہے تو نمایاں صلہ دیا جائے گا۔ میرزا کو خبر ملی تو انھوں نے قصیدہ لکھنے سے یک قلم انکار کر دیا۔ ہر چند دوستوں نے اصرار سے التجا کی کہ شہزادے کی مدح لکھیں، مگر میرزا نے ایک نہ سُنی اور نوکری سے استعفا دے کر اکبر آباد چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر بارِ آخر شاہجہان آباد پہنچے اور ترکِ تعلق کر کے عزلت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ باقی ساری عمر وہیں گزار دی۔ آزاد بلگرامی نے مرزا کی ترکِ مدّاحی اور ردِّ صلہ کی داد دی ہے اور کہا ہے کہ عطا، ہمّتِ امراء ہے اور ردِّ صلہ ہمّتِ فقراء۔ آرزو نے لکھا ہے کہ میرزا تیس برس تک شاہجہان آباد میں مقیم رہے۔ اس حساب سے وہ ۱۱۰۳ھ کے قریب شاہجہان آباد پہنچے۔ اُس وقت ان کی عمر تقریباً ۴۹ برس کی تھی۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ تھا، اس کے عہد کے ۱۵ برس ابھی باقی تھے۔ آرزو ہی نے لکھا ہے کہ شاہِ شہید فرّخ سیر کے عہد کی ابتدا میں مَیں دو بار مرزا کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوا۔ خوش گو کہتا ہے کہ میں شاہجہان آباد میں ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے کہ میرزا نے اپنے آپ کو اغنیا کے دروازے سے ہٹا لیا، تو حق تعالیٰ نے امرائے عصر کو ان کے آستانے پر بھیجا۔ امراء و ارکانِ سلطنت ان کا بے حد اعزاز و احترام کرتے تھے، خصوصاً نواب شکر اللہ خاں کہ وہ اور ان کا سارا گھرانا میرزا کا معتقد تھا۔ شکر اللہ خاں اور عاقل خان رازی سادات خواف میں سے تھے۔ عاقل خاں شہزادۂ اورنگ زیب کے بخشی تھے اور بعد میں شاہجہان آباد کے صوبہ دار بنے۔ شکر اللہ خاں عاقل خان کے داماد تھے اور اپنے خسر کی طرح تصوّف کے جزئیات سے خوب واقف تھے۔ ۱۱۰۸ھ میں فوت ہوئے۔ میرزا کے رقعات میں تعزیت

کا خط ہے، جو شکر اللہ خاں کے مرنے پر میرزا نے ان کے لڑکے کے نام لکھا ہے۔ اس میں کہتے ہیں کہ ۱۲ برس سے اس کا دامن دولت میرے ہاتھ میں تھا (گویا تقریباً ۱۰۹۶ھ سے) رقعات بیدل سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب اور ان کا لڑکا شاکر خاں ہر طرح سے میرزا کی خدمت کرتے تھے۔ چنانچہ میرزا نے اپنے خطوں میں شیشہ ہائے گلاب، مربہ، ڈالی، انبہ، اقمشہ زمستانی خربزہ، روغنِ بادام اور روغنِ گُل ان سے موصول ہونے پر شکریے کے خطوط لکھے ہیں۔ ان سے دِلی محبّت کا اظہار کیا ہے اور ان کی مدح و ستائش دِل کھول کر کی ہے۔ اِس پر صاحبِ نشترِ سخن نے کہا ہے کہ آزاد بلگرامی اور شفیق و والہ نے جو لکھا ہے کہ میرزا نے اربابِ دول کی مدح سرائی نہیں کی، ظاہراً ان بزرگوں کی مراد یہ ہوگی کہ مدّاحی عام نظم میں نہیں کی، یہ بات بے شک ان کے دیوان سے ثابت نہیں ہوتی، ورنہ رقعات میں تو نوّابانِ مذکور کی مدّاحی بافراط موجود ہے۔

کہتے ہیں کہ میرزا نہایت قوی ہیکل تھے۔ جوانی میں سات سیر طعام کھا لیتے تھے۔ بڑھاپے میں یہ مقدار ڈھائی سیر تک اتر آئی تھی۔ لوہے کی جریب جس کا وزن ۲۶ سیر شاہجہانی تھا، ہاتھ میں رکھتے تھے۔ زہد و پرہیز کے باوجود ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر رکھا تھا۔ ایک دفعہ قطب الملک، امیر الامرا سیّد حسن علی خاں، جن سے ان کی پرانی واقفیت تھی، میرزا کو راستے میں ملے۔ میرزا کی وضع قلندرانہ تھی۔ چار ابرو کا صفایا کیے ہوسے تھے۔ سر پر پگڑی کے بجاسے پر کالہ سُوسی باندھ رکھا تھا۔ قطب الملک نے نہ پہچانا۔ وارستگی کے سبب میرزا نے بھی سلام نہ کیا۔ جب قطب الملک پر ثابت ہوا کہ میرزا تھے، تو اُن کے گھر پہنچے، گلہ بواجبی کیا اور انھیں اپنی پالکی میں بٹھا اپنی دولت سراے میں لائے۔ دو تین دن مہمان رکھا، جاتے وقت تین لاکھ روپے کا نقد و جنس ہمراہ کیا۔ نواب کے اخلاقِ کریمانہ پر نظر کر کے قبول کیا

مگر کہا کہ فقیر کے گلیے میں اس ساری نعمت کی گنجائش کہاں ہے اور آپ سے امانت دار تر کون؟ میری امانت یہیں رہے ہے۔ خدا نے چاہا تو ضرورت کے وقت لے کر صرف کر دوں گا لوگ فقیر سمجھ کر ما یحتاج دیتے ہیں اور کچھ روپیہ میراثِ پدر سے پہنچا ہے۔ اس سے بالفعل کام چل رہا ہے۔ انھیں باتوں سے لوگوں کو میرزا کے ساتھ بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ مجموعۂ نغز میں ہے کہ شاعری بیدل کے مرتبے سے فروتر ہے، اس لیے کہ صاحبِ دل تھے اور وارستہ نہاد۔ انتہائی وارستگی اور بے پروائی سے وقت گزارتے، خلقت اُن کے انفاسِ شریفہ سے فیض اُٹھاتی۔ دُنیا سے مُنہ موڑ لیا تھا اور رَہِ رسُولؐ و خدا بیٹھے تھے۔ مخلص نے لکھا ہے کہ وہ جنابِ الٰہی کے برگزیدوں میں سے تھے۔ اور توکّل و استقامت کے طریق پر زندگی بسر کرتے تھے۔

یوں تو میرزا نے بنگال، بہار، اڑیسہ اور میوات وغیرہ کا سفر کیا تھا، مگر آخر عمر میں انھیں لاہور کا سفر ایک مجبوری سے اختیار کرنا پڑا۔ جب سادات نے ۱۱۳۱ھ میں فرخ سیر کے ساتھ نمک حرامی کی تو میرزا نے تاریخ کہی ہ۔

"سادات بُوَے نمک حرامی کردند"

سادات کے شرّ کے خوف سے میرزا کو ناچار لاہور آنا پڑا۔ عبدالصمد خان صوبہ دارِ لاہور بہت تعظیم وتکریم سے پیش آیا اور خدماتِ شائستہ بجا لایا۔ چونکہ سادات کا اقبال جلد ہی ختم ہو گیا۔ لہٰذا میرزا جلدی ہی شاہجہان آباد واپس چلے گئے۔ تھوڑی مدّت کے بعد یعنی محمد شاہ بادشاہ کی سلطنت کے دوسرے جلوسی سال کے ابتدائی مہینوں میں میرزا تپ میں چند روز مبتلا رہے اس کے بعد تپِ محرقہ عارض ہوا۔ ۳، اور ۴، صفر ۱۱۳۳ھ کی درمیانی رات میں کبھی مرض کی شدت ہو جاتی کبھی تخفیف رونما ہوتی، ۴، کی صبح کو حالت دگرگوں ہو گئی اور چھے گھڑی دن گئے میرزا

نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۷۹ سال عمر پائی۔ وفات سے دس برس پہلے گھر کے صحن میں اپنی قبر بنوائی تھی۔ اسی میں دفن ہوئے۔ آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی :-

"میرزا بیدل از عالم رفت"

آرزو نے "چہارم از شہر صفر" سے تاریخ نکالی۔ مگر اس مادّے میں ایک کی کمی ہے۔ مخلص نے کہا :- "ہیہات نماند قطبِ عالی مقدار"۔

دہلی والے ۴ صفر کو میرزا کا عرس کرنے لگے۔ رات کو چراغاں کرتے اور کھانا پکا کر غربا میں بانٹتے۔ میرزا کے کلیات کا ایک صحیح نسخہ قبر پر رکھا رہتا تھا۔ لوگ مسلسل اس کی زیارت کرتے تھے۔ معلوم نہیں یہ عرس کب تک جاری رہا، مگر مخلص نے ۱۱۵۵ھ میں لکھا ہے کہ میرزا کی قبر ان کے معتقدوں کی زیارت گاہ ہے۔ ہر سال محفلِ عرس منعقد ہوتی ہے شعرائے شہر اس خاکِ پاک پر حاضر ہو کر صحبت گرم کرتے ہیں اور اشعارِ سحر آثار پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ بقول ناصر علی سرہندی ؎

خاک گردیدیم و می رقصد ہنوز افغانِ ما
خم شکست اما نمی ریزد می جوشانِ ما

میر عبدالولی عزلت بقول صاحب مآثر الکرام ۱۱۶۴ھ میں شاہجہان آباد آئے اور سالِ تصنیف کتاب مذکور یعنی ۱۱۶۶ھ تک وہیں مقیم تھے۔ ان کے زمانے تک عرس ہوتا تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں مزار میرزا پر گیا۔ سب شاعر جمع تھے۔ میں نے اس نیّت سے میرزا کا کلیات کھلوا کر دیکھوں میرزا کو میرے آنے کی خبر ہے یا نہیں۔ سرِ صفحہ پر یہ شعر نکلا :-

چہ مقدارِ خون در عدم خوردہ باشم ؞ کہ بہ خاکم آئی و من مردہ باشم

مصحفی نے ۱۱۹۹ھ میں لکھا ہے کہ میرزا کی قبر ان کے صحن خانہ میں ہے، اب وہ گھر ویرانۂ محض

ہے۔ بظاہر اس زمانے میں عرس کی رسم ختم ہو چکی تھی۔ مجموعۂ نغز میں جو ۱۲۲۱ھ کی تصنیف ہے حکیم محمد حفیظ خاں کا حال دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ میرزا بیدل کے احفاد سے ہے میرزا نے نظم و نثر کا ایک ضخیم مجموعہ یادگار چھوڑا۔ خانِ آرزو کہتے ہیں کہ اس مجموعے میں ۹۰ ہزار اور ایک لاکھ بیت کے درمیان ہیں۔ بقولِ سرخوش ان کے دیوان میں صرف ردیف میم پانچ ہزار شعر پر مشتمل ہے۔

میرزا کی کلیات میں متعدد مثنویاں شامل ہیں۔ یعنی نسخۂ عرفان، جو تصوف کے رنگ اور حدیقۂ سنائی کی بحر میں ہے۔ طلسمِ حیرت جو یوسف زلیخا کی بحر میں ہے طورِ معرفت۔ محیطِ اعظم میرزا کا ساقی نامہ ہے۔ تنبیہ المہوسین میں کیمیاگری کی مذمت ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی رباعیات ہیں اور دیوانِ غزلیات اور دیوانِ قصائد ہے۔ نثر کی کتابوں میں چہار عنصر اور رقعات شامل ہیں۔

خانِ آرزو لکھتے ہیں کہ میرزا بیدل شعر کے جامع ہیں، غزل، مثنوی، قصیدہ، سب چیز لکھی ہے۔ وہ صاحبِ طرزِ خاص ہیں، سخن کو اس مرتبے پر پہنچایا ہے کہ حافظِ شیراز کے شعر کی طرح ان کے کلام کا انتخاب نہیں ہو سکتا۔ آزاد بلگرامی کہتے ہیں کہ میرزا قلیل الاستعمال بحروں میں قادر الکلامی سے شعر کہتے ہیں۔ مثلاً بحر کامل، بحر متدارک، بحر مطوی، بحرِ خفیف مثمن میں آزاد ہی کہتے ہیں۔

"میرزا معنی آفرینی بے نظیر ہے، مگر عبارت میں ان کا طور خاص ہے، یوں جمہور کی طرز میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ سرخوش نے ان کی معنی یابی اور نازک بندی کو سراہا ہے اور کہا ہے کہ اس عہد میں ان جیسا شاعر غرا اور کوئی نہیں اور مخلص نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ امیر خسرو کے بعد ان جیسا شاعر ہندوستان نے پیدا ہی نہیں کیا۔"

میرزا کے کلام میں حزن پسندی (Pessimism) بہت ہے اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ میرزا کا گھرانہ تصوّف دوست لوگوں کا گھرانا تھا۔ اور میرزا نے بچپن ہی سے فقراء اور صوفیہ کی صحبت میں نشو و نما پائی تھی۔ پھر ہندوستان کی تاریخ کا جو زمانہ انھوں نے پایا، وہ دردناک واقعات سے پُر تھا:

شاہجہان کا قید ہونا، اس کے متعدد لڑکوں کی نکبت، پھر اورنگ زیب کے بعد شاہزادوں کی باہمی جنگ و جدال اور اختلالِ ملک، یہ واقعات کا سلسلہ ایسا تھا کہ ایک حسّاس دل کا حزن و ملال سے پُر ہو جانا اور ترک و تجرّد اختیار کرنا ایک طبعی امر تھا۔ ایک وصلی پر جو میرزا کے اپنے خط میں ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"این عالم اندوہ است، یاران طرب اینجا نیست
جمعیّت اگر خواہید پیشانی و زانو ہا"

اسی رنگ میں لکھتے ہیں:۔

الفت بخت سیہ چون سایہ داغم کردہ است ٭ شش جہت روز است و من دارم ہمان دامانِ شب

مطلبی گر بود از ہستی ہمین آزادہ بود ٭ ورنہ در کنجِ عدم آسودگی بسیار بود

کو فضایی کہ نفس راز دل آزاد کنم ٭ خانہ تنگست برون آیم و فریاد کنم

تا چند بہر مردہ و بیمار بگریم ٭ وقت است بخود گریم و بسیار بگریم

گویند بہشت و ہمان راحت جاوید ؛ جائی کہ بداغی نرسد دل چہ مقام است
مردہ ہم فکر قیامت دارد ؛ از میدن چہ قدر دشوار است

بیدماغی ملاحظہ ہو :۔

دربارِ فردوس وا البود امروز ؛ از بیدماغی گفتیم فردا
گویند بہشت جائے خوبیست ؛ آنجا ہم اگر دماغ باشد

متصوفانہ رنگ میں فرماتے ہیں :۔

در بیابانِ طلب ہر کہ دوچارم گردید ؛ بتمنای تو گردِ سرِ او گردیدم
یارب چہ بودم و بکجا رفتہ ام کہ من ؛ ہر گہ بیادِ خویش رسم گریہ سر کنم

ترک کے متعلق ارشاد ہوا ہے :۔

قطعِ سود و سودا کن ترکِ ہر تمنا کن ؛ می خور وطربہا کن من ہم این عمل دارم

کم تعلقی کے متعلق کہتے ہیں

اگر مردی در تخفیفِ اسبابِ تعلق زن ؛ کز انگشتِ دگر انگشتِ نزدیک بند کم دارد

اور تشبیہات ملاحظہ ہوں :۔

در نیام ہر نفس تیغ دو دم خوابیدہ است ؛ چون سحر در قطعِ ہستی خنجری درکار نیست
چہ وجود و چہ عدم بست و کشادِ مژہ است ؛ چون شرر ہر دو جہان را بنگاہی دریاب

چھوٹی بحر کے ان دو شعروں پر یہ مقالہ ختم ہے :۔

بیدل از یادِ خویش ہم رفتم ؛ کہ فراموش کردہ است مرا
اے محبت اگر اختم بس کن ؛ نفسی بود باختم بس کن

مؤرخانِ اسلام

حسن نظامی، صاحبِ "تاج المآثر"

خلافتِ عباسیہ کے دورِ انحطاط میں متعدد خانوادوں نے کم و بیش مستقل حکومتیں قائم کر لیں۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں خراسان وغیرہ میں ان خانوادوں نے اپنے اور اسلاف کے کارناموں کو اپنے مؤرخوں سے قلمبند کروانا شروع کیا۔ اس سے اگرچہ ان خانوادوں کا حال بالتفصیل ملنے لگا، مگر یہ نقص پیدا ہو گیا کہ جو تاریخ بادشاہوں کے حکم سے اور ان کی نگرانی میں لکھی جانے لگی۔ وہ ان کے معائب بیان کرنے سے بالعموم قاصر رہی اور جو بلند معیارِ صداقت تاریخ نویسی میں اکابر مؤرخین نے قائم کیا تھا وہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ تاریخوں میں قصیدہ خوانی بھی ہونے لگی اور طرزِ تحریر میں سادگی کی جگہ قافیہ پیمائی اور سجع اور انشاء پردازی کے دوسرے تکلفات نے لے لی۔ مؤرخ اُسے سمجھا جانے لگا جو سخن سنجی، عبارت آرائی، رنگین بیانی اور تشبیہ و استعارہ کے ایچ پیچ کا ماہر ہو۔ ابراہیم الصابی کی التاجی اور العتبی کی الیمینی تاریخ نویسی کے اسی دبستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ترک سلاطین بالعموم عربی سے ناواقف تھے۔ جب انھوں نے ہندوستان فتح کیا تو اِس ملک میں فارسی تاریخ نویسی کو قوت حاصل ہوئی اور ہندوستان میں ایک طویل سلسلہ تاریخوں کا لکھا گیا۔ جس کی طرزِ نگارش پر بعض صورتوں میں یمینی والے دبستان

کا اثر پڑا اور نثر میں شاعری کرنے کا خیال اس طرز پر غالب رہا۔

دہلی کی اسلامی سلطنت کا آغاز غوریوں کے زمانے سے ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اگرچہ فخرالدین مبارک شاہ (متوفی سنہ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) نے بھی کچھ تاریخی مواد اپنی کتابوں میں جمع کیا لیکن سلطنتِ دہلی کی باقاعدہ اور قدیم ترین تاریخ لکھنے کا سہرا حسن نظامی صاحبِ تاج المآثر ہی کے سر رہا۔ اس مصنف اور اس کی کتاب کا کچھ حال آج پیش کیا جاتا ہے۔

تاریخ گزیدہ میں ہے کہ نظامی صاحبِ تاج المآثر، نظامی عروضی مصنف مجمع النوادر کا بیٹا ہے۔ نظامی عروضی نثر نگاری اور شاعری کے لیے مشہور ہے۔ نظامی اس کا تخلص ہے اور اس کا نسب ہے: احمد بن عمر بن علی۔ مجمع النوادر، چہار مقالہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ نظامی عروضی ۴۵ سال تک ملوکِ غور کے درباروں میں رہا، لیکن ۵۴۷ھ میں جب سنجر نے غوریوں کو نواحِ ہرات میں شکست دی تو عروضی کوی گمنامی میں عزلت نشین ہو گیا۔ نظامی عروضی کے بیٹے حسن نظامی صاحب تاج المآثر کا حال ہمیں بہت ہی کم معلوم ہے۔ چند باتیں جو اس نے تاج المآثر کے دیباچے میں بیان کی ہیں وہی اس کے سوانح حیات کے متعلق ہمارا پورا سرمایہ ہے۔ دیباچے میں لفاظی کے ایک طوفان کے اندر واقعات کے دھندلے سے خد و خال جو ہمیں نظر آتے ہیں، اردو میں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:۔

"اپنے وطن نیشاپور سے نکلنے کا خیال بھی کبھی میرے دل میں نہ آیا تھا، مگر ان ایامِ فترت میں جبکہ ممالکِ خراسان میں اضطراب واقع ہوا۔ شر و فتنہ کی آگ بھڑک اٹھی اور ابنائے روزگار میں تمیز نہ رہی اور اہلِ معنی سے بے رخی ہونے لگی نوجوانی ہی میں مجھے سفر اختیار کرنا پڑا۔ پہلے تو کچھ دنوں اس امید میں متذبذب رہا کہ شاید حالات پھر درست ہو جائیں، مگر برخلافِ مراد فتنوں کے لشکر

نے "تاخت کی اور مزید صبر ممکن نہ رہا۔ حاسدوں کی شماتت و بشاشت نے دل کو جان سے سیر کر دیا اور اپنے شیخ و مقتدا، قدوۂ مشائخ دہر و اولیاے زمانہ، متوسّل بہ روضۂ رضا، محمدؐ کوفی کے اشارے سے میں نیشا پور سے غزنہ پہنچا۔ مگر تپ میں مبتلا ہو کر مرنے کے قریب ہو گیا۔ بعدِ صحت دہلی کا سفر اختیار کیا اور سیکڑوں صعوبتیں جھیل کر منزلِ مقصود پر پہنچا۔ وہاں پھر بیمار ہو گیا۔ صحت یابی کے بعد مدیرِ زمانہ شرف الملک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے سرپرستی فرمائی۔ دوستانِ خاص نے کہا کہ اگر فارسی میں کوئی کتاب لکھو تو خوب ہو۔ اس لیے کہ اہلِ روزگار کی طبیعتیں قصورِ ہمّت یا قلّتِ معرفت کی وجہ سے فارسی کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ اگر ابناے زمانہ کی مدح میں اسمیں چند بیت بھی ہوں تو یہ کتاب لائقِ وقت اور موافقِ حال ہو گی۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ فضل و کمال اس زمانہ میں وسیلۂ ضعیف اور دست آویزِ باطل ہے۔ اتنے میں فرمانِ شاہی جاری ہوا کہ میں دولتِ قاہرۂ غوریّہ کے مقامات قلمبند کروں، چنانچہ دل نشیط اور اِلِ بسیط کے ساتھ مآثر و مقاماتِ ہمایوں (مغازی) لکھنے لگا۔ اس لیے کہ یہ خدمت دولتِ تمام اور سعادتِ بزرگ ہے اور شرفِ اسلاف کا پیرایہ اور فخرِ اعقاب کا سرمایہ ہے۔"

مختصر یہ کہ حسن نظامی نے شاہی فرمان کے مطابق شعبان ۶۰۲ھ / مارچ ۱۲۰۶ء سے پہلے، جو معزّالدین محمد غوری کے وفات کی تاریخ ہے، تاج المآثر لکھنا شروع کی۔ اس کتاب میں زیادہ تر سلطان قطب الدین ایبک کا حال دیا ہے۔ مگر کتاب کے شروع میں سلطان معزّالدین محمّد بن سام غوری کے غزواتِ ہند کا حال بھی درج کیا ہے اور آخر میں تھوڑا سا حال سلطان شمس الدین

ایلتتمش کا بھی لکھا ہے۔ پہلا واقعہ جو تاج المآثر میں مذکور ہے، وہ فتح اجمیر کا ہے۔ یہ شہر ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں فتح ہوا۔ آخری واقعہ ناصر الدین محمود بن ایلتتمش کے والی لاہور مقرر ہونے کا ہے۔ جو ۶۱۴ھ / ۱۲۱۷ء کی بات ہے۔ پس اس تاریخ میں ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء سے ۶۱۴ھ / ۱۲۱۷ء تک کل چھبیس سال کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ بعض نسخوں میں ایک تکملہ بھی ہے جو ۶۲۶ھ / ۱۲۲۸ء و ۱۲۲۹ء کے وقائع پر ختم ہوتا ہے۔ ان نسخوں میں شمالی ہند کی فتوحات اسلامی اور قیام سلطنت اسلامی کی یہ تاریخ ۳۸ سال کے وقائع پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا نہایت اہم زمانہ ہے۔ مصنف ان اڑتیس سال میں ہندوستان میں موجود تھا۔ اس سے توقع ہوسکتی تھی کہ وہ اس عہد کے نہایت مفصل اور قیمتی حالات ہمیں بہم پہنچائے، مگر سوءِ اتفاق سے مصنف کے نزدیک تاریخ نویسی انشاء پردازی کے مترادف ہے ہر واقعے کے بیان میں اس کا تمام زورِ انشاء پردازی پر صرف ہوتا ہے۔ وہ نثر و نظم کے جواہر پارے مسلسل بکھیرتا ہوا چلا جاتا ہے، مگر یہ بالکل بھول جاتا ہے کہ وہ ایک نہایت اہم زمانے کی تاریخ لکھ رہا ہے اور اخلاف لازمی طور پر اس کے اوراق میں واقعات کی جستجو کریں گے، نہ کہ لفاظی کی۔ حسن نظامی نے اپنے طرزِ بیان کے متعلق کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:۔

"عروسِ معنی کو لطیف عبارتوں اور زیبا استعاروں میں جلوہ دیا گیا ہے اور زمانے کے گوش و گردن کو نثر کے زیور سے آراستہ کیا گیا ہے، جو موتیوں کے ایسے ہار کی طرح ہے جس پر جائیں قربان کی جائیں اور اسے نظم کے ایسے گہنے سے سجایا گیا ہے، جو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ہے۔ ایسی نثر و نظم جن کے مصنف کے نتائج خاطر اور نسائج ضمیر پر مختلف طبیعتیں شیفتہ و مفتون ہو جائیں اور اس کے انواعِ بلاغت اور اقسامِ فصاحت سے جہان والوں کی

آنکھیں خیرہ ہوجائیں اور مؤلفِ کتاب کی قوّتِ مہارت اور فضل و براعت صاحبانِ فن پر مبیّن اور روشن ہوجائے۔"

تاریخ نویسی کے اِس تصوّر کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب میں تاریخی مواد اقل قلیل ہے اور الفاظ کا ذخیرہ بے حساب، برٹش میوزیم کے نسخے میں یہ کتاب سوا گیارہ انچ لمبے اور پونے سات انچ چوڑے ۲۸۰ صفحوں پر ختم ہوئی ہے، مگر اس کا پورا تاریخی مواد ایلیٹ نے انگریزی میں صرف ۲۲۱ صفحوں میں منتقل کر دیا ہے۔ ہاں بزم و رزم کے متعلق اِس کتاب کے اقتباسات جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم مجلد مرتب ہوجائے۔ لیکن باوجود مواد کی کمی کے بعد کے مؤرخین کو اس کتاب کے استعمال سے چارہ نہ تھا۔ اسلیے کہ نظامی معاصر مؤرخ تھا اور دیگر معاصرین نے یہ واقعات قلمبند نہ کیے، یا اُن کے بیانات ہم تک نہ پہنچے۔

اب ہم مصنف کی طرزِ نگارش کو دو ایک مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔ حدود سنہ ۶۰۲ھ میں سلطان معزّالدین سام ہندو کھوکھروں سے جنگ کرنے کے لیے دریائے جہلم کے ایک گھاٹ پر صف آرا ہوا۔ ان دونوں فوجوں کا حال بیان کرتے ہوئے، جو ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑی ہیں، مصنف نے کھوکھروں کو بلبل و صلصل، تذرو و طاؤس کی طرح کے پرندوں اور مسلمانوں کو نہنگ، پلنگ اور ببر و کرگدن کی طرح کے قوی ہیکل اور مہیب درندوں سے تشبیہ دی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"ہندوانِ رزم آزمای صف آرای گشتند، ہمچون بلبل نوازن بر گلبنِ شجاعت و لبانِ صلصل رود نواز بر شاخسارِ جلادت و مانند تذرو خرّم بر نیزہ و خنجر و شمشیر و بکردارِ درّاج بازان بلالہ زوبین و سنانِ خون ریز و بصورتِ طاؤس جلوہ گر بر چمنِ رزم و جنگ و بشبہِ قمریِ دستان سرای

در سرای نام و ننگ و بر مثالِ کبکِ خرامان بر کہسارِ مردانگی و بر منوالِ تذرو شان پای زن بر مرغزارِ فرزانگی و بر عادتِ طوطی منطق فروش در بازارِ حرب و نہب و مثلِ عقاب سخت کوش در ہوای طعن و ضرب و بسیرتِ کلاغ حذر و نفور وقتِ گریز و بصفتِ کلنگ بیدار و ہوشیار ہنگامِ آویز و بشکلِ قطا راہبرِ روزگارِ کارزار و نبرد و نظیرِ خفاش راہ جوی در شبِ تار و لشکر گرد۔

اسی طرح ایک پورے صفحے میں سپاہِ کفر کا حال دے کر کہا ہے :۔

ان کے مقابل میں لشکرِ جرارِ اسلام ساختۂ قتال و آمادۂ جدال تھا۔ اژدر وں کا لشکر زینِ ہیجا پر پیچان اور سمندر کی طرح آتشِ وغا پر غلطان، نہنگ کی طرح زود آہنگ اور تیز حرکت اور پلنگ کی طرح شکار دوست اور بلند ہمت، شیر کی طرح شور انگیز اور رزم جو اور ببر کی طرح خونریز اور تند خو، کرگدن کی طرح بادسطوت اور آتش جوش اور پیل کی طرح برق زخم اور رعد خروش ——— "دبدیں سان دو لشکرِ رزم ساز، حرب آغاز نہادند۔"

۶۰۲ھ میں سلطان شہاب الدین ڈمیک کے مقام پر شہید ہوا۔ دمیک کا گاؤں آج بھی ضلع جہلم میں راولپنڈی روڈ پر سوہاوہ کے شمال میں موجود ہے۔ تاج المآثر میں اس واقعے کی تفصیل دی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ سلطان کے مواکبِ ہمایون حدِ دمیک میں پہنچ کر اُترے اور ایک آبِ صافی کے کنارے خیمہ زن ہوئے جو آئینہ زدوڈ کی طرح روشن و عکس پذیر اور زلفِ زرہ سازِ دلبران کی طرح پُر بند و زنجیر تھا۔ شعر ؎

نہادش چو دریا و کوثر و لیکن | ز زرفی چو دریا بپاکی چو گوہر
ز خوشی چو جان و زخوبی چو دانش | زصفوت چو آب از لطافت چو آذر
روان اندرو ماہیِ سیم سیما | چو ماہِ نو اندر سپہرِ منوّر

تظلّ به ذوب اللجین فان بدات | له الشمس اجرت فوقه ذوب عسجد
تبیت النجوم الزهر فی حجراته | شوارع مثل اللولؤ المتبدّد
فاطمعن فی اشباحهن سواقطاً | علی الماءِ حتی کدن یلقطن بالید

"سراپردہ شاہی کے طناب ایک مرغزارِ نزہ میں کھینچے گئے، جو سوسن و نسرین و گل و یاسمین سے پُر تھا اور جس کی ہوا نمیرالمار سے صاف تر تھی"

اس طرح کے تشبیہ و استعارہ سے مصنف نے ایک صفحہ بھر دیا ہے۔ پھر لکھا ہے :-

"خدا ایگان روی زمین (سلطان السلاطین معزّالدنیا والدّین محمّد بن سام) اسپِ کیکانی سے اتر کر خرمگاہ و خوابگاہ میں داخل ہوا۔ مگر عین الکمال سے متاثر خاطر اور پریشان فکرت، وہ غائلہ محلّت اجل سے جو کسی حیلے سے دفع نہیں ہوتی، مرکبِ اس کی باگ کو تنگ پکڑ رہا تھا اور ز انو بندِ رواحلِ رحلت کھول رہا تھا......."

اس کے بعد متعدد شعر موت کے لاعلاج ہونے کے متعلق لکھ کر مصنف لکھتا ہے :-

"اس اثنا میں چند فرصت جو ملاحدہ نمازِ شام کے وقت، جبکہ نیرِ اعظم نے افقِ غربی میں سر کھینچ لیا تھا اور دن کا پیکرِ نور بخش تارہائے زلفِ معنبرِ شب میں پنہاں ہو گیا تھا......."

مصنف نے دو صفحے نظم و نثر میں اسی طرح رنگین کیے ہیں۔ پھر کہا ہے :-

"اس وقت سلطانِ عالم راز و نیاز کے سجادے پر بیٹھا تھا اور میدانِ وحدت و خلوت میں گوے موانست ڈال کر وردِ تحمید و تمجید اور ذکرِ تقدیس و تنزیہ میں زبان کشا تھا۔ عین اس وقت چند ناپاک آدمی دست لگارد بارگاہِ شاہ کی طرف دوڑے اور فوراً ایک سلاحدار اور دو فراشِ نوبتی کو شہید کیا اور اسی حال میں گردِ راہ سمیت خرگاہِ شاہِ جہاندار کو گھیر لیا اور ان چار خونخواروں میں سے دو تین نے ہفت اقلیم کے بادشاہ کو پانچ چھ زخمِ گراں لگائے اور شاہ کے مرغِ روح نے قصرِ ہشت بہشت اور نہ کنگرۂ آسمان کے شوق میں پرواز کی اور ارواحِ عشرۂ مبشرہ کی طرف شتاباں شتاباں گیا۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایسے جانگداز اور ہولناک واقعے کے بیان میں بھی مصنف نے صنعت سیاقۃ الاعداد کا پیچھا نہیں چھوڑا اور ایک سے دس تک گنتا ہوا چلا گیا ہے۔

تاج المآثر کے مصنف کے بیان کی فصاحت اور روانی اور کلام کے زور میں کچھ کلام نہیں مگر تاریخ اس نے ٹھیک اس طرح لکھی جس طرح تاریخ نہ لکھنی چاہیے۔ اس نے بعد میں آنے والوں کے لیے ایک بری مثال قائم کی، جس کی تقلید منجملہ اوروں کے اسی ساتویں صدی میں وصّاف نے اور اس کے بعد حافظ ابرو اور یزدی نے کی اور صاحب خلاصۃ التواریخ نے تو اس کا تتبع یہاں تک کیا کہ کتاب میں جو کچھ غیر متعلق عنوانوں پر جواب مضمونوں کی صورت میں لکھا، اس کو خود ہی الگ کر کے اس سے ایک پوری انشاء کی کتاب مرتب کر لی۔ جس کا نام خلاصۃ المکاتیب رکھا۔

تاج المآثر کمیاب اور غیر مطبوعہ تاریخ ہے، ہندوستان میں اس کا قلمی نسخہ صرف کتابخانۂ آصفیہ میں ہے، یورپ خصوصاً استنبول میں اس کے متعدد نسخے ہیں۔ برٹش میوزیم کے نسخے کا عکس پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے، جو پیشِ نظر ہے۔

ادبائے اردو

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

بعض باتیں حافظے میں اس طرح محفوظ ہو جاتی ہیں کہ مرورِ لیالی و ایام اور اختلافِ شہور و اعوام سے ان کے نقوش مٹ نہیں سکتے اور "کہن" ہو جانے کے بعد بھی وہ "ہمچنان تازہ" ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ۵۹ سال پیچھے کے ایک واقعے کا حال جو آج بھی ذہن میں موجود ہے، قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ۱۹۰۲ء کے ابتدائی مہینوں میں میں لاہور میں ایف اے کے امتحان کی تیاری میں مشغول تھا اور شیرانوالہ دروازے کے باہر باغ میں جا کر پڑھا کرتا تھا۔ ایک صاحب اُس زمانے میں سیر کرتے ہوئے اس باغ میں سے گزرا کرتے تھے۔ میانہ قد، گندمی رنگ، چہرے پر چیچک کے داغ، عمامہ سر پر باندھے اور روئی دار دگلہ زیب بدن کیے ہوئے تنہا آپ ہی آپ باتیں کرتے پاس سے نکل جایا کرتے تھے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ شمس العلماء مولانا آزاد ہیں۔ ان کی نظم و نثر داخلِ درس تھی۔ اس لیے کتابوں کے ذریعے ان کا بلند نام اور بزرگ شخصیت دونوں مانوس تھے۔ ایک دن اٹھا اور دو کتابیں ساتھ لیں۔ ایف اے کورس فارسی اور دیوان ابو العتاہیہ۔ سلام کیا اور انتخاب سکندرنامہ میں سے ایک مقام کی تشریح کی درخواست کی۔ فرمایا، پڑھو! میں نے شعر پڑھا تو وہ شعر اور اس سے بعد کے چند شعر زبانی پڑھ دیے اور کچھ مطلب بیان کیا۔ پھر میں نے ابو العتاہیہ سے ع وحیلۃ ارض لیس یرجی سلیمہا

والا شعر پڑھا اور "سلیمہا" کے معنی پوچھے۔ فرمایا، یاد نہیں، گھر پر آؤ ہمارے کتاب خانے میں لغت کی کتابیں ہیں، وہ دیکھ کر بتائیں گے۔

ادب اردو کی اس عظیم شخصیت سے یہ خفیف سا تماس میری زندگی کی ناقابل فراموش باتوں میں سے ہو گیا اور جو شغف مولانا کے ادبی کارناموں سے عمر بھر رہا اس کے پس منظر میں اس شرفِ نیاز کی یاد بھی شامل رہی اور مولانا کے شخصی حالات کی تلاش کی محرک بنتی رہی چنانچہ میری التماس پر آغا محمد باقر نبیرۂ حضرت آزاد نے اپنے گھرانے کے افراد اور پرانی یادداشتوں کی مدد سے مولانا کے تمام حالات تفصیل سے جمع کیے اور وہ بعض حواشی کے ساتھ اورینٹل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۳۹ء میں چھاپ دیے گئے۔

تاہم معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک ان کے ورودِ لاہور سے بعد کے حالات اور دورِ ملازمت اور اس کے تاریخ وار کوائف کا تعلق ہے، ابھی اور تحقیق کی گنجائش باقی ہے۔ اس تحقیق کا نہایت مستند اور معتبر سامان حسنِ اتفاق سے میسر آ گیا* اور وہ اب پہلی بار حکام سررشتہ تعلیم پنجاب کی اجازت اور شکریے کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

یہ سامانِ تحقیق پنشن کی ایک درخواست ہے، جو ڈاکٹر (بعد میں سر آرل) شٹائن رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۹۲ء کی ابتدا میں جب کہ مولوی صاحب دماغی عارضے میں مبتلا تھے، مرتب کر کے ان کی طرف سے مسٹر جے، سائم ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کو بھیجی۔ تصدیق کے لیے اس پر دونوں صاحبان کے دستخط ثبت ہوئے۔ اس میں مولوی صاحب کا نام اور پتا یوں لکھا ہے:-

"مولوی محمد حسین آزاد اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج (لاہور) منتعین در اورینٹل کالج"

اس عرضی کے ساتھ ایک مصدقہ یادداشت (میمورنڈم) مولوی صاحب کی جملہ
...مات کی ہے۔ ان کاغذات کی رو سے مولانا محمد حسین آزاد کے والد ماجد کا نام مولوی محمد باقر
...م مغل، مذہب شیعہ اور وطن دہلی تھا۔ تاریخ پیدائش[1] ۵ جون ۱۸۳۵ء اور قد ۵ فٹ ۳ انچ تھا۔
مولانا آزاد مرحوم لاہور آئے تو سررشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازمت کرلی۔ اس ملازمت
...آغاز یکم جنوری ۱۸۶۴ء سے اور اختتام ۲۶ سال [redacted] ماہ اور ۵ دن کے بعد ۵ جون ۱۸۹۰ء
...ہوا۔ اولاً وہ ڈائرکٹری میں ۳۵ روپے ماہوار پر نائب سررشتہ دار مقرر ہوئے، پھر محرّر۔ پہلی
...زمت کی مدت ۵ ماہ اور دوسری کی تقریباً ۱۴ ماہ تھی۔ اس کے بعد وہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۵ء
سے ۲۷ مارچ ۱۸۶۶ء (یعنی تقریباً ۸ ماہ) تک سنٹرل ایشیا اور ایران کے سفر پر رہے، واپسی
...بر سوا دو سال تک وہ یونیورسٹی کالج[2] میں مدرس عربی و ریاضی رہے۔ پھر تقریباً ایک سال پچھتر[3]

---

[1] ایک یادداشت میں جو غالباً مولوی محمد ابراہیم ولد مولوی محمد حسین کی تحریر ہے (اس بنا پر کہ مولانا محمد حسین کو اس میں "والد" لکھا ہے) مولوی محمد حسین کی تاریخ پیدائش ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ دی ہے۔ جو ۱۱ جون ۱۸۳۰ء کے برابر ہے، یہ تحریر ڈاکٹر محمد صادق پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور کے قبضے میں ہے اور ان کی عنایت سے اس وقت میرے سامنے ہے۔

[2] پنجاب میں یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک ۱۸۶۵ء میں شروع ہوئی۔ پہلی غرض یونیورسٹی کے قیام سے یہ تھی کہ علوم مشرقی کی تعلیم پنجاب کی دیسی زبانوں کے ذریعے ہو۔ اس غرض سے اس سال متعدد مدارس کھولے گئے۔ مئی ۱۸۶۶ء میں اسی مقصد کیلیے ایک کالج اور مدرسہ قائم ہوا۔ ظاہراً اسی کالج میں مولانا آزاد کا تقرر ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کالج کھولنے کی اجازت بعض شرائط کے ساتھ دی۔ اس کالج کی جماعت منتظمہ سینٹ کہلاتی تھی۔ جس کا پہلا اجلاس ۱۸۷۰ء میں ہوا۔ بارہ برس کے بعد اسے پنجاب یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا
(باقی صفحہ آئندہ پر)

روپیہ ماہوار پر گورنمنٹ سنٹرل بک ڈپو میں مترجم کا کام کرتے رہے۔ آخر ۵ رجولائی ۱۸۶۹ء کو وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۵۰ روپیہ ماہوار پر اسسٹنٹ پروفیسر عربی مقرر ہوئے۔ تقریباً ۱۰ ماہ تک قائم مقام اور پھر مستقل۔ اکتوبر ۱۸۸۲ء سے وہ اسسٹنٹ پروفیسر اورینٹل کالج متعین ہوئے۔ ۲۰ راکتوبر ۱۸۸۵ء سے تقریباً ۸ مہینے فرلو پر رہنے کے بعد یکم جولائی ۱۸۸۶ء سے وہ پھر گورنمنٹ کالج میں آگئے اور ۳ سال ۳ ½ ماہ کار تدریس میں مشتغل رہے (اس زمانے میں ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریا کی جوبلی کے موقع پر مولانا کو شمس العلماء کا گرانقدر خطاب ملا۔ مگر پنشن کے کاغذوں میں کسی وجہ سے اس کا ذکر نہیں ہوا)

اب مولانا کی ملازمت کے مذکورۂ بالا کوائف ایک نقشے کی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں:-

عہدہ	مشاہرہ	مدت
نائب سر رشتہ دار دفتر ڈائرکٹر صاحب بہادر محکمۂ تعلیم	۳۵ روپے	از یکم جنوری ۱۸۶۴ء تا ۲۵ رمئی ۱۸۶۴ء
محرر دفتر ڈائرکٹر صاحب بہادر	۲۵ روپے	۲۶ مئی ۱۸۶۴ء تا ۲۲ رجولائی ۱۸۶۵ء

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) مگر یہ کالج اورینٹل کالج سے جدا ایک علیحدہ انسٹی ٹیوشن (معہد) تھا۔ اورینٹل سکول ۱۸۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج کے ساتھ ایک ہی زمانے میں قائم ہوا اور ۱۸۷۲ء میں اس کا نام بدل کر اورینٹل کالج رکھ دیا گیا۔ (بروس (Bruce) اے ہسٹری آف دی یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور ۱۹۳۳ء صد ۲۳ بعد)

عہدہ	مشاہرہ	مدت
متعیّن بہ کارِ خاص در محکمہ خارجہ (فارن ڈیپارٹمنٹ)، پنجاب گورنمنٹ		از ۲۳ر جولائی سنہ ۱۸۶۵ء تا ۲۷ر مارچ سنہ ۱۸۶۶ء
مدرّس عربی و ریاضی در یونیورسٹی کالج و لیکچرر انجمن پنجاب	۷۰ روپے	از ۲۸ر مارچ سنہ ۱۸۶۶ء تا ۲۲ر جون سنہ ۱۸۶۸ء
مترجم گورنمنٹ سنٹرل بکڈپو	۷۵ روپے	از ۲۳ر جون سنہ ۱۸۶۸ء تا ۴ر جولائی سنہ ۱۸۶۹ء[1]
قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور	۷۵ روپے	از ۵ر جولائی سنہ ۱۸۶۹ء تا ۱۴ر مئی سنہ ۱۸۷۰ء
اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور	۱۵۰ روپے	از ۱۵ر مئی سنہ ۱۸۷۰ء تا ۳۰ر ستمبر سنہ ۱۸۸۴ء
اسسٹنٹ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور	۱۵۰ روپے	از یکم اکتوبر سنہ ۱۸۸۴ء تا ۱۹ر اکتوبر سنہ ۱۸۸۵ء
رخصت فرلو	۷۵ روپے	۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۸۸۵ء تا ۳۰ر جون سنہ ۱۸۸۶ء
اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور	۱۵۰ روپے	از یکم جولائی سنہ ۱۸۸۶ء تا ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۸۸۹ء

اس کے فوراً بعد مولانا کی علالت کا زمانہ شروع ہو گیا۔ ۱۶ر اکتوبر سنہ ۱۸۸۹ء سے وہ ڈاکٹر کا

---

[1] اس مدت کے لیے مولانا مستحق پنشن نہ تھے۔

تصدیق نامہ پیش کر کے بیماری کی رخصت لینے پر مجبور ہو گئے اور بالآخر ۵ جون ۱۸۹۰ء کو ان کی ملازمت کا سلسلہ ختم ہوا۔ کُل مدّت جس میں وہ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر بمشاہرہ ۱۵۰ روپے فائز رہے ۱۷ سال سے کچھ زائد ہے۔ ان کو پچاس روپے ماہوار پنشن دی گئی، مگر دو سال کے بعد حکّامِ بالا کی سفارش پر، ازراہِ قدردانی اور بجلدوی حسنِ کارکردگی صاحب وزیرِ ہند نے پنشن بڑھا کر ۷۵ روپیہ ماہوار کر دی۔

ملازمت کے آخری حصّے میں مولانا کا خصوصی تعلق پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے تھا۔ انھیں بیماری کی رخصت اورینٹل کالج کمیٹی نے دی اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان کی پنشن کی درخواست پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار نے مرتب کی۔

مولانا کو خللِ دماغ کی وجہ سے پہلے ۱۶ اکتوبر ۱۸۸۹ء سے ۱۵ اپریل ۱۸۹۰ء تک رخصتِ بیماری دی گئی تھی۔ پھر ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۰ء تک مزید چھ مہینے کی رخصت ملی۔ چونکہ ۵ جون ۱۸۹۰ء کو مولانا کی عمر ۵۵ سال کی ہو گئی تھی اس لیے اب چھٹی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۹۰ء کو اورینٹل کالج کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مولوی صاحب کو پنشن پر ریٹائر (متقاعد) کر دیا جائے جنوری ۱۸۹۱ء میں سنڈیکیٹ نے طے کیا کہ پنشن کی سفارش گورنمنٹ کے پاس بھیجی جائے اور جون ۱۸۹۱ء میں سینیٹ پنجاب یونیورسٹی نے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔ جنوری ۱۸۹۲ء میں پنشن کے کاغذات مرتب ہو کر یونیورسٹی سے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کی خدمت میں بھیجے گئے۔

سررشتۂ تعلیم میں مولانا نے جو گراں بہا خدمات سرانجام دیں، اُس زمانے کے رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے ان کی تصدیق یوں کی ہے کہ:۔

"مولوی صاحب نے اپنے فرائض ہمیشہ قابلیت سے ادا کیے، وہ بلند سیرت کے مالک ہیں۔ فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے علاوہ انھوں نے اردو، فارسی

کی درسی کتابوں کی تیاری اور دیگر ادبی کاموں سے سررشتۂ تعلیم کو قیمتی امداد بہم پہنچائی۔ ان کے پنشن لینے کی وجہ یہ تھی کہ اختلالِ ذہنی کے باعث وہ فرائض متعلقہ کی ادائگی کے قابل نہ رہے تھے۔"

اردو، فارسی کی جن درسی کتابوں کا ذکر ہوا، ان کی تفصیل اسی فائل کی ایک یادداشت میں یوں درج ہے۔

"مولوی صاحب نے سررشتۂ تعلیم کے لیے گیارہ کتابیں لکھیں، یعنی اردو کی پہلی اور دوسری (سلسلۂ قدیم)، فارسی کی پہلی اور دوسری، اردو کی ریڈریں پہلی سے چوتھی تک، قصص ہند حصّۂ دوم (صرف مسلمانوں کا حال)، عربی انٹرنس کورس کا ترجمہ اور جامع القواعد (فارسی گرامر) ان کے علاوہ انھوں نے بہت سی کتابوں کی تصحیح اور نظرثانی کا کام انجام دیا۔ مگر سررشتۂ تعلیم کی کتابوں کی تیاری اور نظرثانی کا کوئی مالی معاوضہ انھیں نہ ملا۔ گویہ کام انھوں نے اپنے فارغ اوقات میں کیا تھا۔"

یہ اطلاع بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اثنائے ملازمت سررشتۂ تعلیم میں مولوی صاحب کو کئی ریاستوں کی طرف سے بڑی بڑی تنخواہوں کی نوکریاں پیش کی گئیں، مگر انھوں نے کسی ریاست میں جانا منظور نہ کیا۔ یہ بات بھی جو اس یادداشت میں درج ہے، شاید بعض لوگوں کے لئے نئی بات ہو کہ سنین الاسلام ڈاکٹر لٹینر[1] (G.W. Leitner) کے ایمار سے مولانا آزاد نے مرتب کی، مگر وہ ڈاکٹر لٹینر G.W. Leitner کے نام سے شائع ہوئی۔ گو اس کا اسلوبِ تحریر اصل حقیقت کا غمّاز ہے۔

---

[1] اس کے متعلق ملاحظہ ہو صحیفہ لاہور، بابت دسمبر ۱۹۵۷ء ..... میں ڈاکٹر محمد صادق کا تحقیقی مضمون، "آزاد معاصرین کی نظر میں"۔

ادب اردو کی جو خدمات دہلی اور نواح دہلی کے ان ادیبوں نے سرانجام دیں، جو حوادثِ ۱۸۵۷ء کے بعد لاہور پہنچے اور جن میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اور شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی، مولوی سید احمد، مولوی کریم الدین، ماسٹر پیارے لال آشوب اور دیگر فضلاء شامل ہیں۔ آج تو کسی سے مخفی نہیں اور سب ان کے معترف ہیں، مگر آج سے تقریباً ستر سال پہلے کا یہ سرکاری اعتراف، جو اس کاروانِ علم و فضل کے ایک فرد مولانا آزاد کی نسبت ان کاغذات میں درج ہے۔ بغایت دلچسپ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ :-

"صاحبِ علم و فضل اور شاعر اور ناثر ہونے کی حیثیت سے وہ یقیناً بلند رتبے کے مالک ہیں اور ان کی شہرت شمال مغربی صوبے، اودھ، بہار، صوبجات متوسط اور حیدر آباد دکن تک جا پہنچی ہے۔"

انھوں نے سخت مخالفت کے باوجود شاعری کے ایک دبستان کی بنیاد رکھی ہے۔ اس دبستان کے لازمی اجزاء ہیں :-

سادگی، خوبصورت تشبیہات اور استعارات اور صحت مند اخلاقی رنگ اور مروجہ دُور از کار صنائع بدائع، لفاظی، متکلفانہ تزئین کلام سے احتراز۔

ان کے اشعار ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے، مگر اردو رسالوں اور اخباروں میں منتشر ہیں۔ نثر نگاروں میں ان کا نام صفِ اوّل میں شامل ہے۔ آبِ حیات اور نیرنگِ خیال کو درست طور پر مقبولیت حاصل ہے اور بہت لوگ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ کتابیں کئی بار چھپ چکی ہیں۔ دربارِ اکبری جو ابھی طبع نہیں ہوئی، ان کا نام اور بھی بلند کرے گی ان کی تازہ ترین تصنیف فارسی زبان کی تاریخ ہے۔ جس میں اس زبان کی ساخت اور ژند اور سنسکرت سے اس کے رشتے پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب عنقریب چھپے گی (ظاہرا سخن دان

پارس، یا نگارستان پارس مراد ہے) اخباروں اور رسالوں میں انھوں نے بے شمار مضامین اور ریویو طبع کیے ہیں۔ ان سے چند تو ایسے ہیں کہ ان کے زورِ قلم کو حتمی طور پر منوانے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ تم کلامہ۔

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ گذشتہ صدی کے اواخر ہی میں مولانا آزاد کی ادبی حیثیت ملک بھر میں مسلّم ہو چکی تھی اور تحریر بالا کے مطابق مشہور ادبائے اردو کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ جب تک مولانا کی تحسین ان کو حاصل نہ ہو جائے۔

جن اخباروں اور رسالوں کے لیے مولانا نے مضامین لکھے وہ سب تو اب نہیں مل سکتے، مگر ہم جانتے ہیں کہ ان کے زمانے میں "انجمن قصور" ایک رسالہ نکالتی تھی جس میں مولانا کے متعدد مضمون شائع ہوے۔ مولوی صاحب نے لاہور میں بعض رسالوں کی ادارت کا کام بھی سرانجام دیا۔ اسی شہر سے رسالۂ انجمن اشاعت علوم مفیدہ کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوتا تھا۔ اس کا ایک شمارہ مجموعۂ کتب پروفیسر محمود خان شیرانی مرحوم میں موجود ہے۔ اس میں ۷ / مارچ ۱۸۶۷ء کے ایک جلسے کی روداد دی ہے، جس میں لکھا ہے کہ:

"پریذیڈنٹ لیٹنر نے تجویز کیا کہ مولوی محمد حسین صاحب کو سیکریٹری انجمن مقرر کیا جائے" تو یقین ہے کہ انجمن کو بہت رونق و ترقی ہوگی اور ترتیب رسالۂ انجمن اور کام یونیورسٹی کا بھی ان کے متعلق رہے گا" یہ تجویز منظور ہوئی۔"

(اسی رسالے میں مولوی صاحب کے ایک بیان سے جو اسی رسالے کے ص ۸ پر دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلکتے بھی گئے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "میں سفر کلکتہ سے پھر کر آیا ہوں")

اتالیق پنجاب ایک اخبار ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی سرپرستی میں لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ مولانا آزاد اس کے نائب مدیر تھے۔

مولانا کی کچھ سیاسی خدمات بھی تھیں۔ اس سلسلے میں وہ وسط ایشیا اور ایران گئے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ایران کا سفر انھوں نے دو بار کیا۔ ان سفروں کی کیفیت ایک نایاب مسودے کی بناء پر فاضل معاصر ڈاکٹر محمد صادق نے جنوری ۱۹۵۸ء میں "ماہِ نو" کراچی میں چھپوائی تھی۔ مولانا آزاد نے دُوسرا سفرِ ایران غالباً ۱۸۸۵ء میں کیا، جب وہ فرلو پر تھے۔ اس دُوسرے سفر کے بعض حالات خود مولانا نے "سفرِ ایران" میں دیے ہیں۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

مولانا کے کتابخانے کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہیے۔ ۱۸۹۲ء کے کاغذات پنشن میں اس کی نسبت صرف یہ کہا گیا ہے کہ:۔

"مولانا آزاد کی زندگی کا مفید ترین عملی کام عربی، فارسی، اردو کتابوں کا ذخیرہ ہے جو انھوں نے بغرضِ افادۂ عام جمع کیا۔ اپنی محدود آمدنی کا معتدبہ حصہ انھوں نے ان کتابوں کی فراہمی پر صرف کیا"

یہ کتاب خانہ اکبری دروازے کے باہر قائم کیا گیا تھا۔ مولانا کے صاحبزادے آغا محمد ابراہیم مرحوم نے ۱۹۱۳ء میں اس کتاب خانے کی بہت سی مطبوعہ اور ۲۸۹ قلمی کتابیں (جن میں ۲۲۰ فارسی ۵۸ عربی اور ۱۱ اردو کی تھیں) پنجاب یونیورسٹی کو دے دیں۔ ان میں سے کم از کم ایک قلمی کتاب (منشی عبدالکریم کشمیری کی "بیان واقع") مولانا آزاد نے سر بسر بخطِ خود نقل کی تھی۔ فارسی مطبوعہ کتابوں میں بہت سے ایرانی مطبوعات تھے، جو اب نہایت نایاب ہیں۔ متعدد کتابوں پر مولانا نے مطالعے کے اثناء میں اپنے قلم سے بعض حواشی لکھے تھے۔

جنوری ۱۹۱۰ء میں تقریباً پچاس سال پہلے، اردو ادب کا یہ آفتاب جس نے ملک کی فضاء کو نُور سے معمور کر دیا تھا مغربِ قبر میں پنہاں ہو گیا ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جس دن ان کا انتقال ہوا مسٹر غلام رسول شوق ایم اے سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے جو اس زمانے میں سیکنڈ ایئر کے طالب علم تھے، قطعۂ تاریخ لکھا۔ آخری شعر تھا۔

شوق لکھ آزاد کا سالِ وفات
رحمتِ حق ہو سدا مرحوم پر
۱۳۲۹ھ

ہمارے نئے ثقافتی ادارے

اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

(دسمبر ۱۹۵۲ء)

دائرۂ معارف، یونانی کلمہ "انسائیکلو پیڈیا" کا ترجمہ ہے۔ یونانیوں کے ہاں اس کلمے سے مراد تھی معارف یا علوم کا مکمل دائرہ، یعنی علم کا پورا نظام، یا لفاظِ دیگر جملہ فنون و علوم کی تحصیل۔ بلینیاس (پلینی)، متوفی ۷۹ء نے اپنی کتاب Natural History کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اس کی کتاب یونانیوں کے انسائیکلو پیڈیا کے جملہ مضامین سے بحث کرتی ہے۔ یہ کتاب قدیم ترین دائرۂ معارف ہے جو موجود ہے۔ انگریزی زبان میں یہ کلمہ (انسائیکلو پیڈیا) غالباً سولھویں صدی میں پہلی مرتبہ استعمال ہوا، لیکن یورپ میں انسائیکلوپیڈیا کے نام سے کوئی کتاب قدماء نے شائع کی، نہ قرونِ متوسطہ میں یہ نام کسی کتاب کو دیا گیا۔ سترھویں صدی میں البتہ ALSTED نے ایک کتاب ۱۶۰۸ء میں شائع کی اور ۲۲ سال بعد اُسے پھیلا کر ایک ضخیم کتاب بنا دیا اور اس کا نام انسائیکلو پیڈیا رکھا۔

اسی کلمۂ انسائیکلو پیڈیا کا ایک تنگ تر مفہوم بھی ہے۔ یعنی "علم کی مختلف شاخوں کی جماعت بندی، یا ان کا نظام"۔ سترھویں صدی میں اس کلمے کا اطلاق یورپ میں بعض ایسی کتابوں پر ہوا، جن کی تالیف میں تمام علوم سے مدد لی گئی۔ ان کتابوں میں خاص موضوعوں پر

مکمل یا تقریباً مکمل مجموعہ رسالوں کا مرتب کر دیا گیا۔ انگریزی میں پہلی انسائیکلو پیڈیا، جو حروف ابجد کی ترتیب پر مرتب کی گئی ۱۷۰۴ء میں شائع ہوئی اور انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کا پہلا ایڈیشن ۱۷۷۱ء میں تین جلدوں میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد آج تک مختلف وقفوں سے اس کے نئے ایڈیشن طبع ہوتے رہے ہیں اسی طرح کی انسائیکلو پیڈیا ئیں یورپ کی اور زبانوں میں بھی طبع ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔

یہ تو تھی مغرب کی داستانِ ادب، عربی میں دوائر معارف یا موسوعات یا انسائیکلو پیڈیائیں مذکورہ کتابوں سے صدیوں پہلے وجود میں آئیں۔ ابن عبد ربہ اندلسی (متوفی ۹۴۰ء) کی العقد الفرید ادب عربی کی دائرۃ المعارف ہے۔ ابو نصر الفارابی متوفی ۹۵۰ء نے کتاب احصار العلوم والتعریف باغراضہا لکھی۔ جس میں متعدد علوم کا ذکر ہے۔ یہ کتاب حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔ الخوارزمی، متوفی ۹۹۷ء نے مفاتیح العلوم کے نام سے ایک کتاب سامانیوں کے وزیر العُتبی کے لیے لکھی۔ یہ بھی ایک طرح کی دائرۃ المعارف ہے۔ جس میں ۱۵ نقلی اور عقلی علوم کا کچھ کچھ حال بیان کیا گیا ہے۔ ان کے مصطلحات کی تفصیل دی ہے اور ان کے حدود (یعنی تعریفیں) لکھی ہیں۔ ابو حیّان علی التوحیدی الصوفی نے (جو ۱۰۰۹ء کے بعد فوت ہوا) مُقابسات کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں مختلف علوم کے ۱۰۳ مسائل سے بحث کی ہے۔ یہ کتاب بمبئی، شیراز اور قاہرہ میں چھپی ہے اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اسے نہایت مفید "مفیدٌ جداً" لکھا ہے۔ انھیں کتابوں میں رسائل اخوان الصفا، اور کتاب الاغانی کا شمار ہے۔

اس زمانے تک ایک کثیر تعداد علوم و فنون کی پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ طاش کبری زادہ نے تین سو علوم کے نام گنائے ہیں، جن پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، کسی علم پر کم، کسی پر زیادہ

کتابوں کی اس کثرت سے لازم ہوا کہ جامع العلوم یا دائرۃ المعارف کی قسم کی کتابیں لکھی جائیں، جن میں علوم کا حاصل اور خلاصہ درج کیا جائے، تاکہ قاری بآسانی "ثمراتِ اوراق" پر دسترس پا سکے۔ چنانچہ تیرھویں صدی میلادی میں ابن جوزی اور امام فخر الدین رازی نے اس قسم کی کتابیں لکھیں اور بعد کی صدیوں میں النویری اور ابن فضل اللہ العمری اور السیوطی اور التفتازانی اور الشریف الجرجانی، الدوانی وغیرہم نے دائرہ ہائے معارف لکھیں اور انیسویں صدی میں بطرس البستانی اور فرید وجدی نے جدید مذاق کی دوائر معارف تالیف کیں۔

عربی کی طرح فارسی میں بھی متعدد کتابیں اس قسم کی موجود ہیں۔ چنانچہ ابن سینا نے گیارھویں صدی میں دانش نامۂ علائی لکھا۔ امام فخر الدین رازی نے تیرھویں صدی میں جامع العلوم اور قطب الدین مسعود شیرازی نے چودھویں صدی میں دُرّۃ التاج لکھی۔ یہ سب موسوعات ہیں۔

زبان ہائے پاکستان و ہند میں ہمارے زمانے میں متعدد جامع العلوم کی قسم کی کتابیں لکھی گئیں۔ مرہٹی زبان میں مہا کوش مرتب کی گئی ہے۔ جو ۲۳ جلدوں میں ہے، بنگالی کی انسائیکلو پیڈیا ۲۷ جلدوں میں ہے۔ ہندی میں متعدد موسوعات ہیں، یہاں تک کہ پنجابی (بحروف گورمکھی) میں بھی انسائیکلو پیڈیا ہے، جو سات جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اردو میں کوئی قابلِ ذکر دائرۃ المعارف موجود نہیں ہے۔ گو مدتوں سے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ۱۹۴۰ء و ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے یہ تحریک اٹھی کہ یونیورسٹی کے اربابِ حلّ و عقد سے درخواست کی جائے کہ وہ اردو دائرۂ معارف کی تالیف کا انتظام کریں۔ انھیں دنوں میں عربی فارسی کی کانفرنس کا انعقاد ہوا اور دائرۂ معارف کے متعلق اس مجلس کی ایک قرارداد سنڈیکیٹ میں پیش ہوئی

یونیورسٹی کے مالیات کی حالت اس زمانے میں اچھی نہ تھی۔ اس لیے اس قرارداد سے کوئی خاطرخواہ نتیجہ اُس وقت بر آمد نہ ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی اردو کانفرنس کا جلسہ ہوا اور اس میں یہ مسئلہ پھر پیش ہوا۔ سید محمد عبداللہ رئیس شعبۂ اردو نے اس ضمن میں جو قرارداد پاس کرائی اُسے سنڈیکیٹ کے سامنے رکھا۔ سنڈیکیٹ نے اسے منظور کر لیا اور بیس اصحاب کی ایک کمیٹی بنا کر اُسے ہدایت کی کہ اس منصوبے کے جزئیات پر غور کرے۔ چنانچہ ایک منصوبہ تیار کیا گیا اور اس میں یہ طے کیا گیا کہ دائرۂ معارف اسلامی کی مختلف جلدیں باعتبارِ مضامین تیار کی جائیں۔ مثلاً سیرت پر ایک پوری جلد ہو، تاریخ پر ایک اور جلد ہو، علیٰ ہذا جغرافیہ، ریاضی، طبیعیات وغیرہ پر۔ اس منصوبے کو ملک کے اندر اور باہر کے اہل الرائے بزرگوں کے پاس بھیجا گیا۔ جن کی اکثریت نے یہ رائے دی کہ دائرۃ المعارف کی ترتیب لائڈن کے دائرۂ معارفِ اسلامی کی طرح ابجدی ہو اور مضمونوں کے اعتبار سے اس کو مرتب نہ کیا جائے۔ اس سے انسائیکلو پیڈیا کمیٹی نے بعد غور اتفاق کیا۔

لیکن گو لائڈن کی دائرۃ المعارف کو بہت محنت سے مرتب کیا گیا تھا اور یورپ کے بیسیوں بلند مرتبت فضلا نے انتہائی دقت اور باریک بینی کے ساتھ اپنے معاصرین اور اپنے سے پہلے کے فضلا کی تحقیق و تفتیش کے نتائج اس میں درج کیے تھے، تاہم اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں بعض خامیاں تھیں۔ مثلاً یہ کہ اسلامی دائرۃ المعارف میں توقع یہ ہونی چاہیے کہ مذہبی امور کو بیشتر علماے اسلام کے زاویۂ نگاہ سے پیش کیا جائے نہ یہ کہ اس میں غیر مسلموں کے نظریے، بلکہ اوہام بھی حرفِ آخر کے طور پر سامنے لائے جائیں اور زور اُن کی رایوں پر دیا جائے۔ یہی بات مشرق کی ادبی شخصیتوں اور مشرقی ادب کے تنقیدی مطالعے کے بارے میں صادق آتی ہے۔ دوسری خامی اس میں یہ تھی کہ

گو اس میں انڈونیشیا پر اور اس کے بعد شرقِ اوسط پر بہت توجہ دی گئی، مگر پاکستان و ہند پر پوری توجہ نہیں دی گئی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ لائڈن کا انسائیکلو پیڈیا ہالینڈ میں چھپا، مصارف کا بوجھ بھی وہاں کی ایک جماعت پر تھا اور چونکہ انڈونیشیا پر اس زمانے میں ڈچ قابض تھے اس لیے ہالینڈ کے فضلا کو انڈونیشیا کے متعلق مواد بسہولت تمام میسر تھا۔ شرق اوسط کے متعلق بھی بہت سا لٹریچر موجود تھا اور اس سے استفادہ اہلِ یورپ بآسانی کر سکتے تھے بخلاف اس کے پاکستان و ہند کا مواد کمیاب تھا۔ کئی صورتوں میں یہ مواد اردو یا ہندی میں تھا اور اِس ملک کے مطبوعات کو ڈھونڈنے، بہم پہنچانے اور ان سے استفادہ کرنے میں انھیں نسبتہً بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان و ہند پر مقالات کم اور تشنہ ہیں اور بہت سے اشخاص و بلاد پر مقالے سرے سے غائب ہیں۔ تیسری خامی یہ کہ اسلامی ممالک کے فنونِ لطیفہ پر مضامین بہت کم ہیں۔ چوتھی یہ کہ کتاب کا اشاریہ مرتب نہ ہوا۔ یونیورسٹی کمیٹی نے ان امور کو پیش نظر رکھ کر سفارش کی کہ لائڈن والے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پر بنیادِ کار رکھی جائے، مگر اس میں حسبِ ضرورت کمی بیشی کی جائے۔ کام شروع کرنے کے لیے شعبۂ دائرۂ معارف کا صدر مقرر کیا جائے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں صدر مقرر کیا گیا، پھر متعدد ضروری ماتحت شعبے قائم ہوئے۔ مالیات کے انتظام کے لیے مجلسِ مالیات بنائی گئی۔ ۱۵ ارفضلا کی مجلس ادارت بنائی گئی اور روز مرہ کے معاملات طے کرنے کے لیے پانچ ارکان کی ایک مجلسِ عاملہ (سٹینڈنگ کمیٹی) بنا دی گئی۔ ایک فوری ضرورت یہ تھی کہ شعبے کے لیے مکان ڈھونڈا جائے۔ چنانچہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ اردو کے متصل کی ایک عمارت میں دفتر بنایا گیا۔ کرسی، میز وغیرہ قسم کا ضروری سامان بہم پہنچایا گیا۔ عمّالِ ادارہ (سٹاف) کا انتخاب اور تقرر ہوا۔ لائڈن انسائیکلو پیڈیا کے ناشرین سے ان کی کتاب سے استفادے کی

اجازت حاصل کی گئی۔ لائڈن والے دائرۂ معارف کا ترجمہ عربی اور ترکی میں کیا جا رہا ہے اور اس میں مفید زیادات بھی ہیں۔ اس لیے عربی اور ترکی ایڈیشنوں کے ناشرین سے بھی اجازت حاصل کی گئی، تاکہ ان کے زیادات سے استفادہ کیا جا سکے۔ غرض یہ منازل طے ہوئیں تو اپریل ۱۹۵۱ء سے ترجمہ و تالیف کا کام شروع کیا گیا۔ کام کو چند منزلوں میں تقسیم کیا گیا:۔

منزلِ اوّل یہ کہ لائڈن انسائیکلو پیڈیا کے مادّوں کی فہرست، اردو کی ترتیب ابجدی پر مرتب کی جائے اور جو مادّے بلا تامل قابلِ ترجمہ ہیں، ان کا ترجمہ کر لیا جائے۔ چونکہ لائڈن انسائیکلو پیڈیا کی طباعت ۱۹۰۸ء میں شروع ہوئی تھی اور تقریباً نصف صدی کا زمانہ اس کے بعد گزر چکا ہے اور اب اس کی جلد اول کا موّاد خصوصاً ترمیم طلب ہو گیا ہے، اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ جلد اول کو چھوڑ کر جلد دوم تا چہارم اور تکملے کے ضروری حصوں کا ترجمہ کیا جائے اور چونکہ لائڈن والی اصل کتاب کی طباعتِ دوم شروع ہونے والی تھی، لہٰذا طبع جدید کے شائع ہونے پر اس کی پہلی جلد کا ترجمہ بھی شاملِ کتاب کیا جائے

منزلِ دوم یہ کہ معنوی صحت اور زبان کی درستی کی غرض سے ترجمے پر ادیبوں سے نظرثانی کرائی جائے، تشنہ مواد کی تکمیل کی جائے اور نئے مادّوں کی، جن کا اضافہ ضروری ہو فہرست مرتب کی جائے۔

منزلِ سوم یہ کہ ان مزید مادّوں پر مضمون لکھوائے اور لکھے جائیں۔ منزلِ چہارم یہ کہ سب امور سامنے رکھ کر مقالوں پر نظرِ آخر ڈالی جائے۔ منزلِ پنجم یہ کہ کتاب کی طباعت کی جائے۔ لازم نہیں کہ یہ منزلیں ایک دوسرے کے متعاقب ہوں، ایک ختم ہو تو دوسری شروع ہو، لیکن یہ کام کے مختلف حصّے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ

بھی ایک حد تک سرانجام پا سکیں گے۔

اب تک کتنا کام ختم ہوا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گزشتہ ۲۰ ماہ سے کام جاری ہے۔ لائڈن انسائیکلوپیڈیا میں پہلی جلد کو چھوڑ کر ۳۸۷۵ صفحے ہیں۔ ان میں سے ستمبر ۱۹۵۲ء تک ۲۱۱۳ صفحوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یعنی کام کا ۵۵ فی صدی۔ لائڈن انسائیکلوپیڈیا کا نیا ایڈیشن اب زیرِ ترتیب ہے اور اس کی طباعت ۱۹۵۲ء سے اجزاء کی صورت میں شروع ہونے والی ہے۔ جب نو ترمیم جلد اوّل سامنے آئے گی تو اس کا قابلِ استعمال مواد بھی اسی طرح ترجمہ ہوگا۔ ترجمہ شدہ مواد پر باقاعدہ نظرِ ثانی ہوتی ہے۔ چنانچہ اِس وقت تک نصف سے زیادہ ترجمے پر نظرِ ثانی ہو چکی ہے۔ اسی طرح مواد پر نظرِ آخر بھی ڈالی جا رہی ہے۔

منزلِ اوّل کے کاموں میں سے یہ بھی تھا کہ لائڈن انسائیکلوپیڈیا کے مادّوں کی فہرست اردو کی ابجدی ترتیب کے مطابق تیار کی جائے۔ چنانچہ بڑی تقطیع کے ۲۷۵ صفحوں پر یہ فہرست مرتّب ہو گئی ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ بآسانی معلوم ہو سکے کون سے مادّے پانچ ہزار صفحے کی اس ضخیم کتاب میں موجود ہیں اور کون سے نہیں اور جو موجود نہیں ان کے بہم پہنچانے کا اہتمام کیونکر ہو؟

دُوسری منزل اور تیسری منزل یہ تھی کہ ترجمے پر نظرِ ثانی ہو، ناموجود مادّوں کی فہرست مرتّب کی جائے اور ان مادّوں پر مقالے لکھوائے جائیں۔ بہت سے ترجمے پر نظرِ ثانی ہو چکی ہے اور فہرست مذکور مرتّب ہو رہی ہے اور چند اہلِ علم معاون مصروفِ کار ہیں۔ بعض مادّے، جن کی عدم موجودگی معلوم ہے، ان پر بعض فضلا مضمون لکھ رہے ہیں یا لکھ چکے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں انشاء اللہ ان امور پر زیادہ زور دیا جا سکے گا۔

بعض مقالوں پر نظرِ آخر بھی ہو رہی ہے۔

آخری منزل طباعت کی منزل ہے، مگر آغازِ طباعت سے پہلے بہت سے امور کا طے کرنا ضروری ہے۔ یونیورسٹی پریس جسے کارِ طباعت سپرد ہے، وہ زائد مشینوں کی خرید کا بندوبست کر رہا ہے۔ ایک مشین لگ گئی، دوسری آ رہی ہے۔ کاغذ کا مسئلہ بہت توجہ بکار رکھتا ہے۔ یورپ سے مختلف نمونے منگوائے گئے ہیں۔ ان میں سے مناسب کاغذ کا انتخاب زیرِ غور ہے۔ کئی ٹن کاغذ درکار ہوگا اور وہ ملک سے باہر خاص طور پر بنوایا جانا چاہیے۔ اس کاغذ کو ذخیرہ کرنے کا مسئلہ بھی محتاجِ توجہ ہے۔ تصاویر کے لیے بلاک حاصل کرنے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ اگر اندازے کے مطابق اور حسبِ توقع کام ہوتا رہا اور توفیق رفیق ہوئی تو طباعت کا آغاز ہونے پر کتاب کراسوں کی شکل میں چھپ کر شائع ہونے لگے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

اتنے بڑے کام کے مصارفِ کثیرہ کے لیے کیا بندوبست کیا گیا ہے؟ بالفعل تمام مصارف یونیورسٹی کے ذمے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کا بجٹ ۵۰ ہزار روپے کا تھا۔ سالِ حال میں ۱۸،۶۱۲ روپے صرف ہوں گے۔ ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء کا متوقع بجٹ تقریباً تین لاکھ کا ہے۔ جس میں سے نصف رقم کاغذ کی قیمت ہے۔ اس کام کی اہمیت بے حد زیادہ ہے اور یہ کام ساری قوم کے کرنے کا ہے۔ زندہ قومیں ان کاموں کو درجۂ اوّل کی اہمیت دیتی ہیں۔ مکمل ہو جانے پر یہ کام ہماری قوم کے لیے سرمایۂ ناز و افتخار ہوگا۔ اس کی قومی اہمیت پر نظر رکھتے ہوئے یہ توقع عبث نہیں ہے کہ صوبجاتِ پاکستان کی حکومتیں اور مرکزی حکومت اس کے لیے ضروری مالی امداد کا اہتمام کریں گی۔ خوشی کی بات ہے کہ سالِ حال کے نصفِ اوّل میں ۱۲ ہزار روپے کی ایک قسط مرکزی حکومت

سے یونیورسٹی کو موصول ہو چکی ہے اور اس کے برابر دُوسری قسط کی وصولی کی امروز فردا میں توقع ہے، لیکن ان گراں سنگ اخراجات کے پیش نظر یونیورسٹی نے مرکزی حکومت سے پانچ لاکھ روپے کی گرانٹ کے لیے درخواست کی ہے، جو پانچ سالانہ قسطوں میں ادا کی جائے۔ امید ہے کہ اس کام کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد یونیورسٹی کی درخواست پر پُوری توجہ کی جائے گی، جس کی وہ درخواست مستحق ہے۔ قومیں اپنے کارناموں سے زندہ رہتی ہیں۔ جریدۂ عالم پر دوام اسی کا ثبت ہوتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔

آپ کے کتاب خانے کے لیے

سیر و سیاحت پر کتابیں

(اردو میں)

سیاحت نامے کسی زبان کے ادب کا نہایت مفید، دلچسپ اور اہم جزو ہوتے ہیں۔ صاحبِ علم اور قابل سیّاح عجائباتِ عالم کو بغور دیکھ کر ان کا حال صحیح طور پر قلمبند کرتا ہے اور ان کی کیفیت کو دلچسپ طریق سے ہمارے ذہن نشین کرتا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس سے مفید نتائج اخذ کرتا ہے اور بعد کی نسلوں کے لیے لغایت کارآمد معلومات مہیا کرجاتا ہے۔ اچھے سفرناموں میں نہ صرف جغرافیائی معلومات، یادگاروں اور آثار کے حالات، عجائبات کا ذکر، تاریخی حالات اور مشاہیر کے تذکرے قلمبند ہوتے ہیں بلکہ افکار و آراء اور حوادث و واقعات سے حاصل کیے ہوئے نتائج بھی ملتے ہیں جن سے عبرت گیری میں مدد ملتی ہے۔ جبھی تو فرمایا گیا تھا۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ

("اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ روے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں ان کا انجام کیسا ہوا؟"

غرض مشاہدۂ احوالِ عالم میں چشمِ بینا کے لیے درسِ عبرت موجود اور اس خارجیّت میں داخلیت مضمر ہے۔ آج ہم چند منتخب سفرناموں کا ذکر کریں گے جو اردو زبان میں موجود ہیں۔

سیاحت نامے یوں تو سب مہذّب زبانوں میں تصنیف ہوئے ہیں، لیکن عربی زبان میں چند ایسے سفرنامے لکھے گئے جنھیں عالمی ادب میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ جن سفرناموں کا ہم ذکر کر رہے ہیں، آٹھویں صدی ہجری تک کے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے۔ حج، طلبِ علم، سیاسی اغراض اور تجارت، وہ قوی محرّک تھے، جن کی وجہ سے مسلمانوں نے ہجرت کے بعد کی پہلی آٹھ صدیوں میں دُور دُور کے علاقوں کا سفر اختیار کیا اور سیاحت ناموں میں اپنے تجارب قلمبند کیے، عالمی تجارت میں مسلمانوں کو آٹھویں صدی ہجری تک بے حد نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد ان کی تجارت تنزّل پذیر ہوتی گئی۔ مختصر یہ کہ آٹھویں صدی ہجری تک مسلمان سیّاحوں اور جغرافیین کی ایک کثیر تعداد کا پتا ملتا ہے اور ان کے تینتیس چونتیس نفیس جغرافیے اور سیاحت نامے عربی میں موجود ہیں۔ ان سیّاحوں میں سے تین عالمِ سیاحت کے نہایت روشن ستارے ہیں۔ یعنی البیرونی، ابن جبیر اور ابن بطوطہ۔ حُسنِ اتفاق سے ان تینوں کے عربی سفرناموں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے ہم انھیں کا ذکر کرتے ہیں۔

البیرونی کی کتاب "الہند" کا اردو ترجمہ انجمن ترقیِ اردو نے ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۲ء میں دو جلدوں میں شائع کیا۔ سیّد اصغر علی صاحب مترجم تھے اور مولوی سیّد عطا حسین صاحب نے ترجمے پر نظرِ ثانی کی تھی۔

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی ۳۶۲ھ میں نواحِ خوارزم میں پیدا ہوا۔ ۲۲ برس کی عمر تک اپنے وطن میں رہا۔ پھر کچھ برس جرجان میں قابوس بن وشمگیر کے دربار میں بسر کیے ۴۰۰ھ میں خوارزم شاہ کے دربار میں پہنچا اور ۴۰۷ھ تک وہاں رہا۔ اسی دربار میں ابن سینا سے ملا۔ ۴۰۸ھ میں سلطان محمود غزنوی اسے خوارزم سے غزنی لے آیا، یہاں سے وہ ہندوستان

آیا۔ سنسکرت اور علوم سنسکرت سیکھے اور اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنے مشاہدات و تجربات کتاب الہند کے نام سے عربی میں مرتب کر کے شائع کیے اس نے غزنی ہی میں ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔

بیرونی کو بہت سے علوم میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ فلسفہ تاریخ، السنہ و علوم لسانی، شعر، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ، ان سب میں کمال حاصل کیا تھا۔ اس کا مشاہدہ دقیق اور تنقید فلسفیانہ ہے۔ ذہانت، تحقیق و تجسس اور تبحر میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز ہے اور زمانہ قدیم کا نہیں، زمانہ جدید کا ایک فاضل معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان آکر اس نے اہل ہند کے خیالات اور فلسفے کا دقیق مطالعہ کیا اور ہندوؤں کے ذہنی رجحانات سے خوب واقفیت حاصل کی اور یہ سب حالات معقول، دلکش اور دل آویز طریقے سے بیان کیے۔

البیرونی کے بعد ابن جبیر اندلسی کا ذکر سنیے۔ رحلۃ ابن جبیر کو حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور ۱۹۰۰ء میں یہ کتاب رامپور سے شائع ہوئی۔ عربی متن جو ولیم رائٹ نے ۱۸۵۲ء میں شائع کیا تھا۔ اسی پر حافظ صاحب کا ترجمہ مبنی ہے۔ ابن جبیر ۵۴۰ھ میں اندلس کے شہر بلنسیہ (Valencia) میں پیدا ہوا۔ شاطبہ میں فقہ و حدیث کی تعلیم پائی۔ آخر والی غرناطہ کا میر منشی مقرر ہوا۔ ایک دن اس حاکم نے مے نوشی کے جلسے میں ابن جبیر کو مجبور کیا کہ شراب کے سات جام پیے اس گناہ کے کفارے کے طور پر ابن جبیر نے عہد کیا کہ حرمین شریفین کی زیارت کریگا۔ اپنے آقا سے اجازت سفر حاصل کر کے تمام املاک فروخت کر دیں اور زاد راہ کا انتظام کر کے شوال ۵۷۸ھ میں حج کو روانہ ہوا۔ آخر محرم ۵۸۱ھ میں واپس اپنے وطن

پہنچا اور اپنا سفرنامہ لکھا۔ جس میں عجائب بلاد اور غرائبِ مشاہد کے چشم دید حالات بیان کیے اور مشائخ روزگار سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ وہ سبتہ سے اسکندریہ تک جہاز میں گیا۔ وہاں سے قاہرہ ہوتا ہوا بندرِ عیذاب پہنچا، بحیرۂ قلزم کو عبور کر کے جدّے، وہاں سے حج و زیارت سے شرفیاب ہو کر، کوفے، بغداد، موصل، حلب اور دمشق کی سیر کر کے عکّہ پہنچا۔ عکّہ سے جہاز کے ذریعے سسلی گیا۔ وہاں سے قرطاجنّہ میں اترا اور غرناطہ واپس پہنچا۔ ابن جبیر نے اپنے سیاحت نامے میں ان تمام مقامات کے متعلق مفید اور صحیح تفصیلات دی ہیں، جن کی وجہ سے اس سفرنامے کو عربی کے جغرافیائی ادب میں بلند پایہ حاصل ہے۔ ابن جُبیر نے نہ صرف حرمین شریفین اور حج و زیارت کے حالات بہت وضاحت سے بیان کیے ہیں، بلکہ اس زمانے کی سسلی کے حالات کے لیے بھی اس کی تصنیف اہم مأخذ ہے۔ وہ سلطان صلاح الدین سے نہ مل سکا، لیکن اثنائے سفر میں سلطان کی سلطنت کے مختلف صوبوں سے گزرا اور اس کا بیحد مدّاح ہے۔ لکھتا ہے :-

"اس بادشاہ کو رات دن جہادِ کفّار اور ترقیِ اسلام کے سوا کوئی کام نہیں۔"

مدرسۂ نظامیہ بغداد میں ابنِ جبیر نے شیخ رضی الدین قزوینی امام شافعیہ اور مدرّسِ نظامیہ نیز شیخ ابنِ جوزی حنبلی کے مجالس وعظ میں شرکت کی اور ان مجالس کا نہایت دلچسپ حال لکھا۔

دمشق کی جامع مسجد میں ایک عجیب و غریب میقاتیہ یعنی کلاک دیکھا اور شہر میں اہلِ مغرب کے لیے کئی اوقاف پائے۔ وہ لکھتا ہے :-

"اس شہر میں مسافروں کے لیے بہت سی آسانیاں ہیں۔ خصوصاً حفاظِ کلامِ الٰہی کے لیے ہر قسم کا سامانِ آسائش موجود ہے۔ یوں تو مشرقی ممالک کی ہر بستی میں اہلِ مغرب کے لیے اسی طرح کا اہتمام موجود ہے مگر اس شہر کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ جوانانِ مغرب میں سے جس کسی کو جستجوئے فلاح ہو، اسے لازم ہے کہ تحصیلِ علم کے لیے اپنے وطن کو چھوڑ کر ان ممالک کا سفر اختیار کرے، کیونکہ یہاں اُسے اس کے مقاصد کے حصول میں ہر طرح کی معاونت مل سکتی ہے۔"

بہت سی خوبیوں کے باوجود ابن جبیر کہیں کہیں بعض قدرے تلخی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ مثلاً وہ الجزائر کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس نواح کے کل حکمرانوں نے اپنے ناموں کو لفظ "دین" کے ساتھ رونق دے رکھی ہے (مثلاً زین الدین، بہاء الدین اور فخر الدین وغیرہ) ہر شخص کے نام کے ساتھ ایک باہیبت لقب سننے میں آتا ہے۔ لیکن القاب میں جن صفتوں کا ذکر آتا ہے، ان میں سے کوئی بھی اُن کی ذات میں نظر نہیں آتی۔"

یہ تو تھے البیرونی اور ابنِ جُبیر، لیکن جہاں گردی کے نقطۂ نظر سے ابنِ بطوطہ سے بڑھ کر کوئی سیاح عالمِ اسلام نے پیدا نہیں کیا۔ وہ ۷۰۳ھ میں طنجہ میں پیدا ہوا اور چالیس برس کی عمر میں اپنے وطن سے نکلا اور اُنتیس برس تک سیاحت میں مصروف رہ کر ۷۵۴ھ میں مراکش واپس آیا۔ جہاں ۷۵۶ھ میں اپنے سفر کا حال حافظے سے لکھوایا، اس لیے کہ اس کی تمام یادداشتیں سمندر کے سفر میں لٹ گئی تھیں۔

۷۵۶ھ میں یہ سفرنامہ اس کے مرتب ابن جزی نے مکمل کر لیا۔ ابن بطوطہ اس کے بعد بھی ۲۲ برس تک زندہ رہا۔ اس کے سفرنامے کا پورا نام تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار ہے۔ اس کا اردو ترجمہ دو حصوں میں میرے سامنے موجود ہے پہلے حصے کا اردو ترجمہ سید محمد حیات الحسن رضوی موہانی نے کیا ہے۔ یہ حصہ امرتسر میں ۱۳۱۸ھ میں چھپا۔ مولانا شبلی نے اس ترجمے کی صحت کی تصدیق کی۔ دوسری جلد کا ترجمہ اس سے چند سال پہلے پیرزادہ محمد حسین ہمی ایم' اے نے کیا اور یہ لاہور سے ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔ پیرزادہ صاحب نے اپنے ترجمے میں حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جس میں بعض تصحیحات اور فوائدِ علمی درج ہیں اور دونوں تراجم کے ذریعے اس قیمتی سفرنامے کا مواد اردو خوان حضرات کے مطالعے میں آ سکتا ہے۔

ابنِ بطوطہ ایک ذہین اور تجربہ کار شخص تھا۔ علم و حکمت میں طاق نہ تھا مگر واقعات کی تحقیق کا مادہ اس میں موجود تھا ابن جزی نے اسے "نقیۃُ ثقۃُ صدوقٌ" لکھا ہے اور حقیقتاً اس کے بیانات کی تصدیق مشرق و مغرب کے دوسرے سیاحوں کے سفرناموں سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے سفر کی وسعت حیرت ناک ہے۔ اس نے سینکڑوں مقامات کے دلچسپ حالات اور ملکوں کے تاریخی واقعات صحیح طور پر درج کیے۔ مختلف ملکوں کے بیسیوں علماء و فضلاء و مشائخ سے ملاقات کی۔ امراء و سلاطین سے ملا اور ان کی رعایا کا حال لکھا۔ وہ پہلا سیاح ہے جس نے افریقہ کے اندرونی علاقوں کو دریافت کیا اس کے سفرنامے سے ہندوستان کے مؤرخ کو بھی بہت مدد ملتی ہے۔ اس کی کتاب سے مسلمانوں کے شوقِ سیاحت، بلند ہمتی اور تجارت کی وسعت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے وہ غرناطہ میں ہندیوں سے ملا اور ہندوستان و چین میں اسے غرناطہ والے ملے۔ سبتہ مراکو

کے باشندوں میں سے دو بھائی اُسے ملے۔ ایک چین میں اور دُوسرا بحلمانسہ میں۔ ان دو مقاموں میں چند ہزار میل کا فاصلہ ہے۔

یہ تو آٹھویں صدی تک کا حال تھا۔ اس کے بعد مختلف وجوہات سے مسلمانوں کی تجارت زوال پذیر ہو گئی۔ اس لیے چند سو سال تک ہمیں اچھے سفرنامے نہیں ملتے۔ البتہ سیر و سیاحت کا چرچا گزشتہ سو ڈیڑھ سو سال سے دوبارہ شروع ہوا ہے اور اُردو میں اِس دَورِ دوم سے متعلق متعدد سیاحت نامے ترجمہ اور تصنیف ہوئے ان کا ذکر کرنے سے پہلے ہم مغلیہ دَور کے ایک اہم سفرنامے کا حال بیان کرتے ہیں۔ یہ ہے برنیر کا سفرنامہ۔

۱۸۷۵ء میں کرنل ہنری مور (Moore) نے اس سفرنامے کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا اور خلیفہ سیّد محمد حسین صاحب میر منشی ریاست پٹیالہ اور ان کے بھائی خلیفہ سید محمد حسین خاں وزیر اعظم پٹیالہ کی اصلاح کے بعد یہ ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد مراد آباد میں ۱۸۸۸ء میں اور دوسری جلد امرتسر میں ۱۸۸۶ء میں طبع ہوئی۔

ڈاکٹر برنیر سترھویں صدی کے رُبع اوّل میں فرانس میں پیدا ہوا۔ وہ ہندوستان میں بارہ سال رہا۔ ان میں سے آٹھ سال اورنگ زیب بادشاہ اور دانشمند خان کی سرکار میں پیشۂ طبابت میں صرف کیے۔ پھر اپنے وطن کو واپس ہوا اور وہاں سے ۱۶۷۰ء میں اپنا سفرنامہ شائع کیا۔ اس نے شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانے کے حالات مفصل لکھے ہیں۔ سیّد محمد حسین صاحب نے ترجمے پر نہایت مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے، جو ان کے وسیع مطالعے، بلند تلاش اور فضلِ عزیز پر دلالت کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا عالمانہ تنقیدی اور تفسیری حاشیہ آج سے چھہتر۷۶ سال پہلے اس مُلک

میں شائع ہوا۔

دورِ دوم کے سیاحت ناموں کا اس فرصت میں صرف سرسری ہی ذکر ممکن ہے ان میں سے کچھ تو سفرِ حج سے تعلق رکھتے ہیں، کچھ اسلامی ممالک کے سیاحت نامے ہیں، کچھ یورپ اور دیگر ممالک کی سیر سے متعلق ہیں۔

حرمین شریفین کے سفر ناموں میں سے خاص طور پر قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا فاضلانہ سفر نامہ سبیل الرشاد بہت پسندیدہ ہے۔ یہ ۱۹۲۴ء میں لاہور میں چھپا سفرنامہ حرمین شریفین جو مولوی حکیم محمد محی الدین حسین ویلوری نے ۱۳۳۱ھ میں شبلی گنج سے شائع کیا، وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ اس سلسلے میں سفر دار المصطفےٰ بھی قابلِ ذکر ہے۔ جو برٹن Burton کی انگریزی کتاب کے ایک حصّے کا ترجمہ ہے۔ برٹن ۱۸۵۳ء میں مدینۂ شریف گیا تھا، یہ ترجمہ مولوی انشاء اللہ خاں نے لاہور سے شائع کیا۔

دیگر اسلامی ممالک کے سیاحت ناموں میں مولانا شبلی کے سفر نامۂ روم و مصر و شام کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مولانا نے یہ سفر ۱۸۹۲ء میں کیا۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خاص طور پر اسلامی ممالک کے کتاب خانوں کی سیر اور ان ممالک کی طرزِ تعلیم اور ترقیِ تعلیم کا اندازہ کیا جائے۔ یہ کتاب دہلی میں طبع ہوئی۔ اسی سلسلے میں دو اور کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی مسز میکس ملر کی سیاحتِ قسطنطنیہ ہے۔ اصل کتاب ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی۔ خواجہ رشید الدین مودودی نے اس کا اردو ترجمہ ۱۹۰۲ء میں آگرے سے شائع کیا۔ اس کتاب میں استانبول کے عام حالات مولانا شبلی کی کتاب سے زیادہ ہیں، دوسری کتاب سر شیخ عبد القادر کی مقامِ خلافت ہے۔ جس میں استانبول کے قابلِ دید

مقامات کا حال تفصیل سے دیا ہے۔ اس کتاب کا بہت عمدہ باتصویر اڈیشن دہلی سے شائع ہوا۔ اسلامی ممالک کے سفرناموں میں سفرنامۂ خواجہ حسن نظامی بھی ہے جو سیاحتِ مصر، فلسطین و شام و حجاز کا حال بتاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ سفر ۱۹۱۱ء میں کیا، کتاب کا تیسرا اڈیشن پیش نظر ہے، وہ ۱۹۲۲ء میں دہلی میں چھپا تھا۔

یورپ کے سفرنامے متعدد ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں سرسیّد کے ناتمام سفرنامے کا ذکر کرنا چاہیے، جو سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق میں چھپا۔ سرسید ۱۸۶۹ء میں ولایت روانہ ہوئے۔ ان سے چار سال بعد یوسف خاں کمل پوش حیدر آبادی ثم اللکنوی کا عجیب و غریب سفرنامہ عجائباتِ فرنگ کے نام سے لکھنؤ میں چھپا۔ مولانا محمد علی نے خود اپنے اسفارِ یورپ کے حالات قلمبند کیے اور پروفیسر محمد سرور جامعۂ ملیہ دہلی نے یہ کتاب لاہور میں طبع کرائی۔ آخر میں ہم الحاج سید سلیمان ندوی کی دلچسپ کتاب سیر افغانستان اور شیخ محمد بدر الاسلام فضلی کی حقیقت جاپان کے ذکر پر اس مختصر تبصرے کو ختم کرتے ہیں۔ سیر افغانستان حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ــــ اور حقیقتِ جاپان کو انجمن ترقیِ اردو نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔

استانبول کے خزائن مخطوطات[1]

مدّت سے استانبول کے کتاب خانوں کی تعریفیں سنتے تھے، مگر ان کو دیکھنا خواب و خیال کی بات تھی۔ اس سال حسن اتفاق سے ۲۵ ستمبر ۱۹۵۶ء سے ۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء تک دس دن ان کتاب خانوں میں گزارنے کا موقع ملا۔

وکانت بالعراق لنا لیال • سرقناھن من ریب الزمان

جعلناھن تاریخ اللیالی • وعنوان المقاصد والامانی

(رشید طبیب در لطائف الحقائق نسخۂ استانبول)

مگر اتنی قلیل مدّت میں کیا دیکھا جا سکتا تھا؟ حق یہ ہے کہ تمام وقت اسی طرح سے گزرا کہ نظارہ جنبشِ مژگاں سے گلہ دار تھا اور میں ضائع شدہ عمر پر بے حد متاسف، تلافیٔ مافات میرے لیے تو ممکن نہ تھی، مگر میں نے اسی وقت ارادہ کر لیا کہ ملّت کو ان کتاب خانوں کی طرف متوجہ کروں گا اور یہ پیغام ان تک پہنچا دوں گا کہ،

جن اصحاب علم کو نوادر مخطوطات کی تصحیح و نشر کا شوق ہے — اور اس کے بغیر اسلامی تہذیب کی تاریخ مکمل صورت میں کیسے سامنے آ سکتی ہے اور جو ہمارے

---

[1] خطبۂ صدارت جو پاکستان اورنیٹل کانفرنس (اجلاس لاہور) منعقدہ دسمبر ۱۹۵۶ء کے شعبۂ علوم اسلامی میں ۲۹ دسمبر ۱۹۵۶ء کو پڑھا گیا۔

ماضی کے شاندار علمی کارناموں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، جو کسی خاص دور کی تاریخ کا مواد طلب کرتے ہیں، جو ہمارے عہدِ گذشتہ کے علم و فضل اور آرٹ کے تطوّر کے نمونے دیکھنا چاہتے ہیں، ان کو جو کچھ اور جتنا استانبول میں یکجا مل سکتا ہے، اس کو اور جگہ ڈھونڈنے کی کوشش عبث ہے۔

اس اجمال کی اب تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں:۔

کتابوں کے جمع کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا شوق مسلمانوں میں قدیم ایام سے موجود رہا ہے۔ ابن ندیم (طبع فلوگل صد ۲۴۲) نے لکھا ہے کہ خالد بن معاویہ (م ۸۵ھ) جسے "حکیم آل مروان" کہتے ہیں محبِ علوم تھا، وہ پہلا شخص ہے جس نے غیر زبانوں سے عربی میں ترجمے کا کام شروع کرایا، مصر سے عربی دان یونانی فلسفیوں کی ایک جماعت کو بلوایا اور انھیں حکم دیا، کہ یونانی اور قبطی زبانوں سے کیمیا کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کریں۔ بنو العبّاس کے ابتدائی زمانے ہی میں خصوصاً بعہدِ مأمون مختلف ملکوں سے کتابیں جمع کی گئیں۔ مامون نے بیت الحکمۃ قائم کیا۔ اور علومِ قدیمہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوکر عام ہوگئیں۔ اس دور میں رومی زبان کے علاوہ فارسی، "ہندی"، نبطی وغیرہ سے بھی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ بتدریج کتابوں کا شوق خلفاء کے علاوہ امراء و وزراء اور علماء تک پہنچا۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری میں ابو ہِفّان المہزمی مورخ اور راویۂ مشہور نے لکھا کہ میں نے جاحظ (م ۲۳۹ھ/ ۸۵۳ء)، فتح بن خاقان (م ۲۴۷ھ/ ۸۶۱ء) اور قاضی اسمٰعیل بن اسحٰق مالکی (م ۲۸۲ھ/ ۸۹۵ء) سے بڑھ کر عاشقِ کتب و عاشقِ علوم نہ کسی کو دیکھا نہ سنا (الفہرست ۱۱۶)۔ فتح بن خاقان کے کتاب خانے کے متعلق ابن ندیم ہی نے لکھا ہے کہ کتابوں کی کثرت اور خوبصورتی کے اعتبار سے اس کتاب خانے سے بہتر

کتاب خانہ کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ چوتھی صدی ہجری میں اکثر بڑی بڑی مسجدوں میں وقف کتابیں جمع ہونے لگیں۔ متعدد دار العلم وجود میں آئے، جہاں علاوہ درس و تدریس کے "خزائن الحکمۃ" یعنی علمی کتاب خانے بھی تھے۔ عضد الدولہ دیلمی کے کتاب خانۂ شیراز کا ذکر مقدسی (ص ۴۴۹) نے قدرے تفصیل سے کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب خانے کی الگ عمارت تھی۔ اس وقت تک کی جملہ تصنیفات اس کتاب خانے میں جمع تھیں، وکیل وخازن ومشرف مقرر تھے۔ کتابیں 'خزائن' یا 'بیوت' یعنی الماریوں میں چنی ہوئی تھیں، مگر صرف اہلِ وجاہت ہی اس کتاب خانے میں جا سکتے تھے، کتاب خانے کی دو فہرستیں تھیں، جن میں کتابوں کے نام درج تھے۔ اس صدی کے اواخر میں قرطبہ، قاہرہ اور بغداد، تینوں دار الخلافوں میں ایسے خلفاء موجود تھے، جو غایت درجہ کتاب دوست تھے۔[1] اس صدی کے آخر میں "قرادۃ الکتب" (یعنی کانونِ مخطوطات) بغداد ہی کو سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ثعالبی (یتیمۃ الدہر طبع اول ۴: ۲۷۶) ابو نصر سہل بن مرزبان اصفہانی متوطن نیشاپور کے ترجمے میں لکھتا ہے کہ وہ بار بار بغداد جاکر کتابیں خرید کر لاتا تھا اور نیشاپور میں اس کے سوا کسی کے ہاں جدید کتابیں نہیں ملتی تھیں۔

خلفاء کے علاوہ امراء نے بھی کتاب خانے جمع کیے۔ چنانچہ سامانیوں، غزنویوں، سلجوقیوں، خوارزم شاہیوں، ایوبیوں سبھی نے کتاب خانے بنائے۔[2] آٹھویں صدی ہجری، چودھویں صدی میلادی میں قلقشندی نے "صبح الاعشیٰ" م: ۴۶۶ میں لکھا ہے کہ عالم اسلام کے بزرگ ترین کتاب خانے تین تھے:

---

[1] جاحظ کے ایک رسالے بعنوان "فی مدح الکتب والحث علی جمعہا" کے لیے دیکھیے Z.D.M.G بابت ۱۹۱۴ء ص ۳۸۹

[2] رک بہ ص ۷۷ح۔

۱۔ خلفائے بنی عباس کا کتاب خانہ جو بغداد میں تھا اور جس میں لاتعداد نفیس ترین کتابیں جمع تھیں، حملۂ تاتار میں اس کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

۲۔ فاطمیۂ مصر کا کتاب خانہ جو عظیم ترین کتاب خانوں میں سے تھا اور جس میں تمام علوم کی نفیس کتابیں جمع تھیں۔ آخری فاطمی خلیفہ العاضد کی وفات کے بعد دولتِ فاطمی ختم ہو گئی تو سلطان صلاح الدین کے وزیر القاضی الفاضل (عبدالرحیم بن علی البیسانی دم ۵۹۶ھ/ ۱۲۰۰ء) نے اس کتاب خانے کی اکثر کتابیں خرید لیں اور مدرسۂ فاضلیہ قاہرہ پر جو قاضی مذکور نے بنایا تھا، وقف کر دیں۔ پھر بتدریج اس مدرسے کی کتابیں لوگوں نے اڑا لیں اور قلقشندی کے زمانے (چودھویں صدی عیسوی) کے آخر میں اس میں تھوڑی ہی سی کتابیں باقی تھیں۔

۳۔ اندلس کے بنو امیّہ کا کتاب خانہ یہ بھی بزرگ ترین کتاب خانوں میں سے تھا، جب ملوک طوائف کا غلبہ ہوا تو یہ کتابیں بکھر گئیں۔

ہو سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا بے حساب علمی دولت کا کچھ حصہ سابقہ ترکی ولایات مصر، شام اور عراقِ عرب کے راستے سے استانبول میں بھی پہنچا ہو۔ بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ آج نہ صرف عالمِ اسلام میں بلکہ دنیا بھر میں عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کا جتنا بڑا ذخیرہ استانبول میں موجود ہے اور کہیں نہیں۔ پروفیسر احمد زکی ولیدی طوغان نے مجھے بتایا

۲؎ ملاحظہ ہو تتمۂ صوان الحکمۃ جس میں علی بن زید بیہقی (دم ۵۶۵) نے ذیل کے کتاب خانوں کا ذکر کیا ہے (ان میں سے بعض کی کتابوں کو اس نے خود بھی دیکھا تھا): خزانۂ خوارزم شاہ مامون بن محمد (دم ۴۰۷) تتمہ ص ۸۹، خزانۃ السلطان الاعظم سنجر (ایضاً ص ۹۲)، خزانۂ عزیز الدین فقاعی در مرو (حواشی تتمہ ص ۱۹۴) خزانۂ کتب نقیب النقباء بالری (تتمہ ص ۱۷) خزانۃ النظامیہ بنیسا پور (تتمہ ص ۹۴ و ۹۶)

کہ ان مخطوطات کی تعداد ایک لاکھ پینتیس ہزار ہے۔ ترک مؤرخین اس بارے میں خاموش ہیں کہ یہ ذخائر کیسے جمع ہوئے۔ لیکن چونکہ آلِ عثمان کی فتوحات بحرِ خزر سے لے کر بحرِ اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی تھیں، گمان کیا گیا ہے کہ اپنی کتاب دوستی کی وجہ سے ان بادشاہوں نے ان ممالک کے بعض ذخائرِ کتب کو محفوظ کر کے اپنی بنا کردہ مسجدوں اور مدرسوں پر وقف کر دیا۔ مگر اس کے علاوہ اور ذرائع سے بھی ان کے ہاں کتابیں جمع ہوئیں۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ سلاطینِ عثمانی اور ان کے امراء و وزراء اور شیوخِ اسلام کی قدردانی اور داد و دہش کی وجہ سے بہت سی کتابیں خود مصنفین نے ان کے لیے لکھیں یا ان کو بھیجیں مثلاً عبدالقادر مراغی (م۔ ۸۳۸ھ) نے سلطان مراد ثانی کے لیے موسیقی پر ایک کتاب لکھی اور ۸۲۶ھ میں وہ شخصی طور پر اسے پیش کرنے کے لیے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بیٹے اور پوتے نے تو اپنے آپ کو عثمانی دربار سے وابستہ ہی کر لیا اور ان تینوں کی تصانیف "فنِ ادوار" پر استانبول کے کتاب خانۂ نورِ عثمانیہ میں موجود ہیں۔

مولانا جامی نے سلطان بایزید دوم کو اپنا کلیات بھیجا (منشآت فریدون بیگ ۱:۳۶۱) الشقائق النعمانیہ میں کئی علماء و فضلاء کا ذکر موجود ہے۔ جنھوں نے آلِ عثمان کی سرپرستی سے فیض پایا۔ دوسرے سلاطین بھی اپنے ملک کے علماء کی کتابیں تحائف میں شامل کر کے بھیجتے ہوں گے۔ چنانچہ ان کتاب خانوں میں ہندوستان کے فضلاء اور شعراء کی کتابیں مثلاً مکتوبات امام ربانی اور رقعات بیدل موجود ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی شاید ایسے ہی ذرائع سے یہاں پہنچی ہوں۔

ان کتاب خانوں میں عربی فارسی مخطوطات کے اس قدر قیمتی اور نایاب ذخیروں کو دیکھ کر انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے اور پہلا سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اتنی

مدیوں تک حرق و غرق سے کس طرح محفوظ رہیں؟ دیمک اور کتاب کے کیڑوں نے کس طرح چھوڑا؟ اور کتاب دزدوں سے کیوں کر بچیں؟ نم اور گرمی اور طرح طرح کے حوادث سے گزر چکنے کے بعد یہ کس طرح قابلِ استفادہ رہیں؟ کیا ابوسعد عبدالرحمٰن بن محمد بن دوست نے یونہیں کہہ دیا تھا:۔

علیك بالحفظ دون الجمع فی الكتب۔ فان للكتب آفات تفرقها

الماء یغرقها والنار تحرقها والفار یخرقها واللص یسرقها

حالانکہ گمان ہوتا ہے کہ اجیالِ گزشتہ کا یہ سرمایہ بجنسہٖ ہم تک پہنچ گیا۔ لیکن تحقیق کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ یہ گمان کہ ماضی کا سرمایہ بجنسہٖ ہم تک پہنچ گیا، بے بنیاد ہے۔ حدود ۱۸۸۲ء میں استانبول کے ایک فرانسیسی مجلے نے لکھا تھا کہ ان کتاب خانوں سے بہت سے مخطوطات لوگوں نے مستعار لیے اور پھر واپس نہ دیے اور ان قیمتی نسخوں میں سے بعض دست بدست ہوتے ہوئے اروپائی کتاب خانوں میں پہنچ گئے۔ اُس کا اندازہ تھا کہ اس کے زمانے میں ان نقصانات کے بعد بھی صرف آٹھ کتاب خانوں ہی میں (یعنی فاتح، ایا صوفیہ، سلیمیہ، سلیمانیہ، عثمانیہ، بایزید اور ایوب میں) تقریباً ایک لاکھ مخطوطات ابھی باقی تھے جو علاوہ علومِ اسلامی کے تاریخ، فلسفہ، شعر اور ان تمام علوم قدیمہ سے متعلق تھے۔ جن علوم سے بقول اس کے "اروپائی تہذیب ماخوذ ہے"۔ اُسی زمانے میں سلطان نے ایک عالم صالح افندی کو استانبول کے کتاب خانوں کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا۔ جب اس فاضل نے کتابوں کا محاسبہ کیا، تو معلوم ہوا کہ بہت سی کتابیں غائب ہو چکی ہیں۔ سلطان عبدالمجید (۱۸۳۹-۱۸۶۱ء) کے زمانے میں عمارت کی مرمت کے وقت ایک کتاب خانے کے مخطوطات مسجد سلطان احمد کے تہ خانے میں رکھے گئے، مگر یہ تمام مخطوطات نم سے

ناقدین استفادہ ہو گئے۔ (شرح ابن یعیش بر مفصل زمخشری، طبع یان، جلد ۱، لیپزگ ۱۸۸۲ء دیباچہ: شرکا تحریر ۔۔۔ بیعہ)

ان بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ایک عرصے تک ان کتاب خانوں سے غفلت برتی گئی۔ ۱۸۸۲ء کے قریب ان کی طرف دوبارہ توجہ دی گئی اور فہرستیں مرتب کی گئیں۔ مرحوم مولانا شبلی صاحب سفرنامۂ مصر و شام و روم اس سے دس سال بعد استانبول پہنچے اور ان کتاب خانوں کی زیارت کی۔

مولانا کے زمانے کے مقابلے میں اب حالات بہت بہتر ہیں۔ کتاب خانوں کی عمارتیں سنگین، عمدہ اور خاصی روشن ہیں اور بجلی کی روشنی بھی موجود ہے۔ کتاب دار اور فراش مقرر ہیں، جو کتاب خانے میں نے دیکھے ان میں کرسی، میز وغیرہ سامان موجود پایا۔ بلکہ ایا صوفیہ میں تو صوفے بھی ہیں۔ اب مخطوطات کے ذخیرے مطالعے کے کمروں سے الگ ہیں۔ قاری مطالعے کے کمرے میں پہنچ کر حسب معمول کتاب دار کو چٹ دیتا ہے اور وہ کتاب منگوا کر حاضر کر دیتا ہے۔ مولانا شبلی کو شکایت تھی کہ اسلامی مدارس کے طالب علم اور دیگر قارئین فقط مشہور و متداول مذہبی کتابوں ہی کا مطالعہ کرتے تھے؛ اب یہ صورت بھی باقی نہ تھی۔ رسم خط کے بدل جانے سے اب عربی فارسی مخطوطات کے مطالعہ کرنے والے اہل ترک کم تھے۔ لیکن انقلاب ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۳ء کے بعد یہ ضرور ہوا ہے کہ چند ترک متخصصین کے نزدیک عربی، فارسی کی عمدہ کتابوں کی قدر پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے اور انھوں نے عربی فارسی کتابوں کی تصحیح و نشر کا کام بہت اہتمام سے کرنا شروع کر دیا ہے، بالخصوص اپنی (ترکی) تاریخ کے مواد پر بہت توجہ صرف کی ہے۔

استانبول کے قیمتی خزانوں سے پورا انتفاع تھوڑے سے وقت میں اسی صورت

میں ممکن ہے۔ جب مغربی طرز کی عمومی، جامع اور مفصل فہرستیں اس سارے ذخیرے کی موجود ہوں۔ سوءِ اتفاق سے وہ موجود نہیں۔ شعرِ ترکی کے مخطوطات کی فہرست کے چند کرّاسے طبع ہو چکے ہیں، مگر عربی، فارسی مخطوطات کی مفصل فہرست یا فہرستیں خدا جانے کب تالیف اور طبع ہوں گی۔ اس باب میں پراگ کے پروفیسر فیلکس ٹاور Felix Tauer نے لکھا ہے:

"مذکورۂ بالا کتاب خانے صحیح معنی میں علم و ادب کے خزانے ہیں۔ دُنیا کے کسی حصّے کو لیں، کہیں بھی کسی ایک شہر میں فارسی، عربی اور ترکی کے اتنے مخطوطات نہ ملیں گے جتنے استانبول میں ہیں، مگر بدبختی سے ان کتاب خانوں کے محتویات کے صحیح علم کے حصول کے لیے سامان موجود نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اکثر وقف کتاب خانوں کے مطبوعہ دفاتر (یعنی فہرستیں) موجود ہیں، مگر یہ دفاتر اس وقت سے تقریباً ۴۰ سال پہلے طبع ہوئے تھے [دفاتر مذکور سنہ ۱۳۰۱ھ اور سنہ ۱۳۱۲ھ کے درمیان طبع ہوئے، یعنی سنہ ۱۹۵۶ء سے ساٹھ ستّر سال پہلے] مگر یہ صرف ناموں کی فہرستیں ہیں، جو بہت غیر صحیح اور فاحش اغلاط سے پُر ہیں۔ ان کے سوا کچھ قلمی فہرستیں بھی ہیں، مگر یونیورسٹی لائبریری کی فہرست کے سوا یہ کچھ زیادہ اچھی نہیں خصوصاً عربی فارسی مخطوطوں کے کوائف ان میں غلط بیان ہوئے ہیں۔ خیر، استانبول کے عربی مخطوطات کے متعلق تو بہت مواد شائع ہو چکا ہے، مگر عام فارسی مخطوطات پر اب تک صرف پال ہارن Paul Horn کا مقالہ ہی طبع ہوا ہے اور اس نے بھی چند مستثنیات کے علاوہ "دفاتر" ہی کی بنا پر مخطوطات کو (صرف) مضمون وار مرتب کر دیا ہے، لہٰذا تمام غلطیاں جو "دفاتر" میں ہیں، پال ہارن کے مقالے میں بھی موجود ہیں۔"[1]

Journal of The Czechoslovak Oriental Institute, Prague

Vol III Nos. I & V پراگ سنہ ۱۹۳۱ء صـ ۸۷۔

جن چالیس "دفاتر" کا ذکر پروفیسر فیلکس ٹاور نے کیا ہے، ان کا کوئی نسخہ مجھے ستمبر گزشتہ میں (۱۹۵۵ء) استانبول کے کتاب فروشوں کے ہاں نہ ملا۔ وہ اب کلیتہً نایاب ہوگئے ہیں۔ البتہ استانبول کے کتاب خانوں میں موجود تھے۔ پال ہارن کی فہرست جس کا ذکر پروفیسر ٹاور نے کیا ہے۔ جرمن رسالہ .Z.D.M.G کی جلد بابت ۱۹۰۰ء میں دو قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۱۰۳۶ نسخوں کا ذکر ہے۔ پروفیسر فیلکس ٹاور نے استانبول کے کتاب خانوں میں ۵۵۵ کتب تاریخ ایسی پائیں جن کی زبان فارسی ہے۔ موصوف نے چند مقالوں میں ان کا حال لکھ کر پراگ میں شائع کیا۔ پروفیسر ٹاور نے صحیح کہا ہے کہ استانبول کے عربی مخطوطات پر نسبتاً زیادہ کام ہوا ہے۔ پروفیسر ریشر[1] O. Rescher نے ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان ان مخطوطات کی سات فہرستیں حواشی کے ساتھ مجلہ .Z.D.M.G اور دیگر رسالوں میں طبع کیں۔ یہ فہرستیں بیشتر کتب صرف و نحو، لغت و ادب، تاریخ و فقہ سے متعلق ہیں اور کتاب خانہ ہائے کوپریلی، ینی جامع، نور عثمانیہ، توپ قاپو سرائے، مسجد لالہ لی اور فیضیہ میں موجود ہیں۔ ریشر (.Z.D.M.G بابت ۱۹۱۰ء ص ۴۸۹ جلد ۱) نے استانبول کے عرب مخطوطات کی پانچ اور فہرستوں کا ذکر کیا ہے، جو اس سے پہلے علمائے فرنگ نے مرتب کیں۔ بلاؤ Blau (م ۱۸۶۹ء) نے اپنی فہرست کو مجلہ .Z.D.M.G شمارہ ۸/۷ میں شائع کیا، روڈوکناکس Rhodo-Konakis نے تین مخطوطات کا حال Nöldeke Festschrift (۳۸۵:۱) میں لکھا۔ ہورووٹز Horoivtz نے صرف عربی تاریخی مخطوطات کا حال بیان کیا۔

---

[1] اس فاضل مصنف سے اسی سفر میں استانبول میں ملاقات ہوئی۔

اسی طرح بقول ریشر (محل مذکور) سوسس ہائم (Westasiatische Studien 1907) (Süssheim[1] نے بھی عربی مخطوطات کا حال Beit. zur Kenntnis des Orients میں لکھا۔ ان لوگوں کے بعد کتب حدیث پر میکس وائس وائلر Max Weisweiler نے Istanbuler Handschriftenstudien zur Arabischer traditions پر اپنی کتاب استانبول سے ۱۹۳۷ء میں شائع کی اور فہمی ادھم اور ایوان شوکین Ivan Stchoukine نے کتاب خانہ دانش گاہ استانبول کے مصوّر نسخوں کا حال ۱۹۳۵ء میں پیرس سے شائع کیا اور ہنری ہاورڈ Henry Howard نے ۱۹۳۶ء میں Journal of the American Orienial Society ص ۲۲۷ تا ۲۴۶ میں ایک مقالہ شائع کیا بعنوان Preliminary Materials for a Survey of the Libraries and Archives of Istanbul مسٹر وقار احمد ہمدانی نے Some Rare Manuscripts in Instanbul کے

---

[1] Süssheim نے اناطولیہ کے کتب خانوں (بروصہ، قونیہ، مغنیسیا) کا حال بھی Beit مذکور میں لکھا۔ دیکھیے Manuale: Gabrieli روما ۱۹۱۶ء ص ۱۲۵۰ اور Z.D.M.G. بابت ۱۹۱۰ء جلد ۱ ص ۶۸۹

آماسیہ کے کتاب خانے کے ۳۲ نوادر کا حال استاذ احمد آتش نے مجلہ تاریخ وثیقہ لری استانبول اگست ۱۹۵۵ء میں شائع کیا ہے، بعنوان اناددلو کتب خانہ لرندن بعض نادر اثرلر: (آماسیہ) شاید اس سلسلے میں اور مضامین بھی بعد میں شائع ہوئے ہوں۔ کتاب خانۂ راغب پاشا استانبول کی فہرست ۱۳۱۰ھ میں طبع ہو گئی تھی اگر اس کے بعض عربی نوادر کا حال جناب احمد توزک نے نشریات مجموعہ سی جلد ۲ طبع استانبول ۱۹۵۸ء ص ۹۱ تا ۱۰۳ میں شائع کیا۔ آقائے زکی ولیدی طوغان نے اسلام تتقیق لری انیسٹیوٹو سی درگینی بابت ۱۹۵۶ء ۱۹۵۷ء جلد ۲ حصہ ۱ ص ۵۹ تا ۸۹ میں ذیل کے کتاب خانوں کے بعض نوادر کا حال لکھا:- انقرہ۔ دل تاریخ وجغرافیہ فیکلٹی سی کتب خانہ سی (استانبول)۔ قیصریہ (راشد آفندی کتب خانہ) فخری بلگہ سی۔

عنوان سے ۱۹۳۸ء کے JRAS میں ایک مختصر مقالہ عربی و فارسی مخطوطات پر لکھا۔ پروفیسر شپیز O.Spies نے بھی .Stambular Hdss پر ایک رسالہ لکھا ہے (براکلمان تکملہ ۲: ۲۲۸ و ۳۱۶) اس میں عربی زبان کے ان نوادر مخطوطات کا حال دیا ہے جو تاریخ وغیرہ سے متعلق ہیں اور کتب خانہ ہائے استانبول میں موجود ہیں۔ دوسری عالمی جنگ میں اس کتاب کے نسخے جل گئے اور اب نایاب ہیں میکس کراؤزے Max Krause نے اُن مخطوطات استانبول پر ایک مقالہ لکھا ہے جو ریاضی سے متعلق ہیں۔ بعنوان:-

Stambater Hss. Islamischer Mathematiker Quellen u. Stn. zur Geschichte der Mathem., Astron., u. Phys.

Abh. B. Stu., Bd 3, Heft 4. در

پروفیسر رٹر (H. Ritter) نے مجلہ Oriens جلد ۲، شمارہ ۲، ص ۲۳۶، ۳۱۴ پر اناطولیہ اور استانبول کے مخطوطات کا حال دیا ہے۔ بعنوان:

Philologia XIII. Arabische Handschriften in Anatolia und Istambul.

جب ۱۹۵۱ء میں مستشرقوں کی بین الاقوامی کانگرس استانبول میں منعقد ہوئی تو وہاں کے نوادر مخطوطات کی ایک مختصر مگر مفید فہرست، بقیہ اسم کتاب خانہ ارکان کانگرس کے لیے مرتب کی گئی جو ۳۸ صفحوں پر ختم ہوئی اور استانبول میں ۱۹۵۱ء میں طبع و نشر ہوئی۔ اس کا عنوان ہے:-

Istambul Umumie Kütüphaneleri Yazmalari Sergisi.

یونیسکو نے تین پروفیسروں کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ جس میں پروفیسر رٹر، استا

احمد آتش اور پروفیسر ڈوڈا شامل ہیں۔ پروفیسر رٹر کمیٹی کے صدر ہیں، وہ دواوین و مجموعہ ہائے شعر فارسی کے ان مخطوطوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں جو استانبول کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔ میں نے ستمبر ۱۹۵۶ء میں ان کو استانبول کے کتاب خانوں میں مصروفِ کار پایا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں پروفیسر رٹر نے مجھے استانبول میں بتایا کہ فہرست مرتب ہوگئی ہے مگر یونیسکو ابھی اس کی طباعت کے لیے تیار نہیں)

دانش گاہِ تہران کے فاضل پروفیسر آقاے مجتبیٰ مینوی بھی چودہ پندرہ مہینے[1] سے استانبول میں مقیم ہیں اور حکومت ایران کے صرف سے عربی فارسی کے نادر اور منتخب مخطوطات کی نقلیں مائکرو فلم کے ذریعے لے رہے ہیں۔ جب میں ان سے ملا تو وہ تقریباً ۸۰۰ نقلیں لے چکے تھے اور ان نسخوں کی مکمل فہرست تالیف کرنے کے لیے عالمانہ طریق پر مواد بھی فراہم کر رہے تھے۔ استانبول کو "شہرِ مخطوطات" کہنا غالباً انھیں کی ایجاد ہے۔

غرض استانبول کے کتاب خانوں میں اسلامی دُنیا کے علم و فضل کے صدیوں پُرانے آثار ہزاروں ایسے نادر مخطوطات کی صورت میں موجود ہیں، جن کا اور ملکوں میں سراغ تک بھی نہیں ملتا۔ کامل و مکمل، صاف و خوشخط، مستند و معتبر، مضبوط و صحیح۔ استانبول کے استاذ محمد فواد سزگین کا اندازہ ہے کہ استانبول میں "پانچ سو سے سات سو تک" مخطوطات عربی و فارسی و ترکی ایسے ہیں جو مصنّفین کے خود نوشتہ ہیں۔ بیسیوں نسخے مصنفوں کے خطوط سے نقل ہوئے ہیں اور مصنفوں نے خود ان کی صحت کی تصدیق کی

---

[1] دسمبر ۱۹۵۶ء؛ ۱۹۵۸ء میں سفارت خانۂ کبریٰ ایران انقرہ میں بعض سرکاری فرائض سرانجام دے رہے تھے اور میں نے سنا تھا کہ فہرست میں مخطوطات کی فلم گیری کا کام بھی کر رہے تھے۔ دانش گاہِ تہران کے مجلّۂ دانشکدۂ ادبیات بابت اکتوبر ۱۹۵۵ء، جنوری و دسمبر ۱۹۵۶ء میں انھوں نے بعض نوادر کا حال بھی لکھا ہے۔

ہے۔ بیسیوں نسخے نامور کاتبوں کے خط میں ہیں۔ پھر تجلید و تذہیب اور تصویر کے نادر ترین نمونے بھی موجود ہیں۔ ایسے کہ ان کو دیکھ کر آدمی عش عش کر اٹھے۔ آنکھوں کا نور، دل کا سرور، کتاب کو ہاتھ سے رکھنے کو جی نہ چاہے۔ چند مثالیں سنیئے :

جب لین Lane نے قاہرہ میں بیٹھ کر اپنی لغت مد القاموس مرتب کی، تو اس کو صاغانی کی عباب اور تکملۂ صحاح کے مطالعے کی ضرورت پڑی۔ اسے معلوم ہوا کہ ایک کتاب خانے میں دونوں نسخے موجود ہیں۔ مگر دریافت کرنے پر کتابدار نے بتایا کہ دونوں کتابیں غائب ہیں۔ چوری گئیں یا لوٹ میں جاتی رہیں۔ اس لیے کہ صاحب تاج العروس نے مستعار لی تھیں اور وہ فوت ہوئے تو ان کی کتابیں لٹ گئیں۔ ان میں یہ دونوں کتابیں بھی گئیں۔ مگر آج عباب کی ایک خوشخط مشکول جلد استانبول میں موجود ہے اور تکملۂ صحاح کا نفیس اور کامل نسخہ بھی وہاں ہے۔

الاغانی للاصفہانی مورخ ۵۲۶ھ وہاں ہے۔ ابن منظور (م ۷۱۱ھ) صاحب لسان العرب نے مختار الاغانی لکھی، جس میں اس نے اغانی کے تراجم کو الف بائی ترتیب سے اضافات کے ساتھ از سر نو مرتب کیا۔ یہ نسخہ بخط ابن منظور استانبول میں ہے۔ مگر افسوس کہ جلد ۱ و ۵ و ۶ و ۸ موجود نہیں۔ جلد ۲ ساری کی ساری ابونواس کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ اصفہانی نے ابونواس کا ترجمۂ مفردہ نہیں لکھا۔ اس لیے ابن منظور نے یہ ترجمہ خود لکھ ڈالا۔ جلد ۴ کے آخر میں تاریخ تعلیق ۶۷۹ھ دی ہے۔ براکلمان (تکملۂ ۱ : ۲۲۶) نے اس کتاب کے اور نسخوں کا بھی پتا دیا ہے۔ ثعالبی کی کئی کتابیں استانبول میں موجود ہیں۔ مثلاً التمثیل والمحاضرۃ (نقل در ۸۵۹ھ از نسخۂ محررۂ در ۵۷۶ھ ایا صوفیہ میں ہے) غرر البلاغۃ، کنز الکتاب، یواقیت المواقیت اور رسائل (نقل

۱۰۲۸ھ)۔ کتاب الانساب لابی سعد عبدالکریم السمعانی وقفیۂ گِب نے عکسی چھاپی لیکن اصل نسخہ ایسا تھا کہ اس سے پورا استفادہ بہت مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔ استانبول میں نفیس، کامل نسخہ موجود ہے اور اس کا منتخب بھی ؛ درطوپ قاپو) ان کے علاوہ سمعانی کی "ادب[1] الاملاء والاستملاء" بھی ہے (در فیضیہ براکلمن: تکملہ ۱: ۵۶۰ ، ۱)

تمثال الامثال جمال الدین محمد بن علی القرشی المکّی الشافعی کا عمدہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی میں ہے۔ مگر اس کا عمدہ نسخہ استانبول میں بھی ہے۔

ابوعلی الفارسی کی "کتاب الایضاح" ہبۃ اللہ بن الحسن الکاتب کے خط میں نقل ہوئی۔ اس نے اپنا نسخہ ایسے اصل سے نقل کیا جو جوالیقی کے خط میں تھا۔ اور جوالیقی اس کتاب کو ابوزکریا تبریزی سے روایت کرتا ہے۔ اور نسخۂ مقر پر ابوزکریا تبریزی کی تصدیق بدیں مضمون درج تھی کہ وہ نسخہ ۴۸۸ھ میں مدینۃ السّلام میں اسے پڑھ کر سنایا گیا (قرئ علیہ)

اسرار الحکماء ایک رسالہ یاقوت المستعصمی خطاطِ مشہور نے نصائح اور تصوّف کے مضامین پر تصنیف کیا۔ یہاں وہ یاقوت کے اپنے خط میں موجود ہے بتحریر ۶۸۶ھ نہایت نفیس چرمی جلد میں مجلد، جس پر زرحل اور لاجورد کے نقش بنے ہوئے ہیں۔ حاجی خلیفہ نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ "بساتین الفضلاء و ریاحین العقلاء تاریخ یمینی" کی شرح ہے۔ جسے حمید الدین النجاتی النیسابوری شاگرد علامہ قطب الدین شیرازی نے ۷۰۹ھ میں ختم کیا۔ نسخۂ استانبول نسخۂ مصنّف سے نقل ہوا اور اسے علاء ابیوردی نے

---

[1] اس کتاب کو میکس وائس وائلر نے ۱۹۵۲ء میں لائیڈن سے شائع بھی کر دیا ہے۔

۱۵ ار جمادی الآخری سنہ ۷۳۳ھ میں ربع رشیدی تبریز سے خریدا۔ صفدی کی الوافی بالوفیات (۷ جلد، در نور عثمانیہ) ابو عبید القاسم کی "غریب الحدیث" (نقل ۵۹۶ھ، در کوپریلی) اور اسی کی "کتاب الامثال" (در کوپریلی) اور "شرح کتاب الامثال" للبکری تینوں کے عمدہ نسخے یہاں ہیں۔ "نقائض" جریر والاخطل کا قدیم نسخہ اور دواوین زمخشری، کشاجم، الصاحب ابن عباد اور المعتز باللہ بھی ہیں۔ دیوان المعتز کا نسخہ ابو فراس الہمدانی کے کتاب خانے کا ہے۔ ایک مجموعہ دیوان "لقیط الایادی" اور "المحاورۃ" اور "لامیۃ العجم" کا ہے۔ محررہ ۸۲۹ھ جو ہرات میں یاقوت مستعصمی کے خط سے نقل ہوا۔ محمد بن ابراہیم الانصاری الوطواط الکتبی (م ۷۱۸ھ) کی "غرر الخصائص الواضحۃ وعرر النقائص الفاضحۃ"، النحاس کی شرح "معلقات" اور "رسائل الخوارزمی" اور "رسائل السیوطی" اور "المختار من رسائل ابی اسحاق الصابئ" اور مجموعہ رسائل ابی ہلال العسکری" اور "معجم الصحابہ" لابن قانع (م ۳۵۱ھ) جس کے "اوہام وتصحیف" کے خلاف ابن فتحون مالکی نے اپنا رسالہ لکھا (تکملہ بروکلمان ۱: ۲۷۹) اور "نزہۃ المشتاق" للادریسی یہ سب موجود ہیں۔ البیرونی کی آثار الباقیۃ کا نسخۂ نفیسہ کتاب خانۂ بایزید میں ہے، جس کی مدد سے کتاب کے مطبوعہ اڈیشن کو بعد تصحیح دوبارہ شائع کرنا چاہیے۔ اور اسی طرح "احوال الہند" (در کوپریلی) اور "القانون المسعودی" (در بایزید) کے عمدہ نسخے بھی یہیں ہیں۔ بیہقی کی

لہ ربع رشیدی رشید الدین طبیب نے آباد کیا تھا۔ جمادی الاولیٰ ۷۱۸ھ میں رشید مقتول ہوا اور ربع رشیدی لوٹ لیا گیا۔ عجب نہیں کہ یہ نسخہ رشید الدین کے کتاب خانے کا ہو۔ جو لوٹ کے بعد فروخت ہوا۔ اصفہانی کا خود نوشتہ نسخہ ایسکوریال میں ہے (تکملۂ بروکلمان ۱: ۵۷۸)

تتمۂ صوان الحکمۃ کو یہیں کے تین نسخوں کی مدد سے بعد تصحیح لاہور میں طبع کیا گیا تھا یہاں اس کا ایک چوتھا نسخہ بھی نظر آیا۔ بعض اور نوادر یہ ہیں :۔

ذیل تاریخ الذہبی، الحافظ الشیخ ولی الدین احمد العراقی کے والد حافظ عبدالرحیم العراقی (م ۸۰۶ھ) نے "العبر للذہبی" کا ذیل لکھا تھا۔ یہ کتاب اس ذیل کا ذیل ہے۔ اور ۷۶۲ھ تا ۷۸۶ھ کے حوادث پر مشتمل اور خط مصنف سے منقول ہے (در کوپریلی) رأس مال الندیم لاحمد بن علی بن بابی مؤرخ تحریر ۸۲۹ھ در نور عثمانیہ، دوسرا نسخہ در ینی جامع (براکلمان تکملہ ۱ : ۵۸۶) اس میں تاریخی وقائع درج ہیں ؛ "مرآۃ الزمان فی تاریخ اہل الزمان" لسبط ابن الجوزی مکمل نسخہ (در مدینۂ اوقاف) "عقد الجمان" لبدر الدین العینی بخط مصنف (در ولی الدین)؛ "ابانۃ عن سرقات ابی الطیب المتنبی" تالیف ابی سعد محمد بن احمد العمیدی م ۴۳۳ھ، قدیم نسخہ جو عجب نہیں کہ بخطِ مصنف ہو۔

فارسی مخطوطات میں سے چند نوادر یہ ہیں :۔

"طبقات المشایخ" خواجہ عبداللہ انصاری کا خوشخط نسخہ (محررۂ ۸۳۹ھ عہد شاہرخ)؛ "جامع العلوم" امام فخر رازی (مؤرخ در ۹۰۴ھ)؛ "رحیق التحقیق" مثنوی مبارک شاہ غوری (ایا صوفیہ کے ایک مجموعے میں)؛ ابن اسحٰق کی سیرت رسول اللہ اور غزالی کی احیاء علوم الدین کے فارسی ترجمے۔

چنگیزخانیوں اور تیموریوں کے متعلق مواد کی افراط ہے۔ تاریخ چنگیز خانی

لہ تب: Walther Hinz: Quellenstudien zur Geschichte der Timuriden Z.D.M.G. جلد ۹۰ (۱۹۳۶ء) ص ۳۵۷،

[illegible]

[illegible]

[illegible] نسخوں میں سے جو یہاں

[illegible] کا نسخہ ہے جو [illegible] اس کا عکس اب میرے
پاس ہے [illegible] تاریخ تیمور" جو اواخر عہد تیمور اور ابتدائے عہد شاہرخ
کی تاریخ ہے۔ اہم کتاب ہے۔ اس کے یہاں دو نسخے ہیں (دیکھیے ٹاور Tauer
شمارہ ۲۴۲ و ۲۱۵)

سلطان احمد بن خاوند شاہ حسینی کا "ظفر نامہ" جو ابوالفتح بدیع الزمان بہادر
خان کے حکم سے تالیف ہوا (در فاتح؛ ٹاور Tauer ۴۲۰، غالباً منحصر بفرد نسخہ)۔
اسی زمانے کے لیے مفید مواد کتب ذیل میں مل سکتا ہے جو یہاں موجود ہیں،

• جوامع الانشاء از ہروی جس میں ابوسعید مرزا کا فتح نامہ، سلطان حسین بایقرا
اور حسن بیگ کی مکاتیب اور اسی زمانے کے اور بہت سے مکتوب (در نور عثمانیہ)

"منشآت" از زمانِ شاہرخ تا ابوسعید مرزا؛ مؤرخ در ۸۸۶ھ، در کتابخانہ یونیورسٹی استانبول "دستورالکاتب لتعیین المراتب" از ہندو شاہ نخچوانی تالیف بنام اویس بن بہادر خان جلائری (م ۷۷۷ھ) (دیکھیے "کشف الظنون" ۱: ۷۹۲) (در ایاصوفیا)؛ "دیوان امیری" اس میں بایسنغر اور علاء الدولہ کی مدح میں قصائد بھی ہیں، نہایت نفیس نسخہ (در ایاصوفیا) "اشعار خواجہ ابوالوفاء خوارزمی"[۱] دم ۸۳۵، معاصر شاہ رخ در کتاب خانۂ موزۂ ہمایون) "مکارم اخلاق" از کمال الدین حسینی خوارزمی دم ۸۴۰ھ) شارح "مثنوی مولانا روم" زمان شاہ رُخ (یہ کتاب امیر شاہ ملک کے لیے لکھی گئی) "کتاب التشریح" یعنی اناٹومی Anatomy کے مضمون پر فارسی میں مصور نسخہ جو ۸۱۳ھ میں تبریز میں نقل ہوا۔ "مجموعۃ الرسائل" از نعمان الدین خوارزمی امامِ امیر تیمور، حمد اللہ قزوینی کے "ظفرنامے" کا حال کچھ عرصہ ہوا برٹش میوزیم کے نسخے کی بنا پر ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا گیا تھا۔ میوزیم میں اسے منحصر بفرد قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کے دو نفیس قدیم نسخے مدیریۂ اوقاف (ترک اسلام اثرلر موزہ سی) میں ہیں۔ "فرائد غیاثی" کے دو ہی ناتمام نسخے میرے علم میں تھے۔ یہاں ۸۲۱ھ کا ایک نسخہ بظاہر مکمل موجود ہے۔ میخانے کے دو ناقص الاول نسخے ہندوستان میں ملے تھے، یہاں کامل نسخہ موجود ہے۔

یہ مخطوطات مختلف کتاب خانوں میں ہیں۔ مدیریہ اوقاف میں قرآن مجید کے بہت سے قدیم الخط نسخے ابتدائی اسلامی خطوط میں ہیں اور فارسی عربی کے مصور نسخوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔

۱؎ رک برای دی بہ مطلع سعدین جلد ۲ جزو ۳ : ۱۱۰۴۔

توپ قاپو سرائے میں بایسنغر بن شاہرخ مرزا، یعقوب مرزا آق قوینلو اور بہرام مرزا صفوی کے مرقعات اور جُنگ ہاے تصاویر ہیں۔

اس داستان کو کہاں تک طول دیا جائے اور آپ کے حسن سماعت سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جائے؛ مخطوطات کے علاوہ استانبول میں خزینۂ اوراق و اسناد (Archives) بھی ہے، جس میں آل عثمان کی تاریخ اور ثقافت کا نہایت اہم مواد موجود ہے۔ حکومت ترکیہ پر اور اہل علم پر ان مخطوطات اور دیگر علمی مواد کی مفصل اور جامع فہرستیں مرتب کرنے کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ ایسی فہرستوں کے بغیر ترکی اور اسلامی بلکہ عالمی ثقافت اور ادب کی تاریخ کے متعلق تحقیقات ہمیشہ نامکمل رہے گی۔

ہمارے نقطۂ نظر سے بے حد ضروری ہے کہ مائکروفلم کے ذریعے ان کتابخانوں کے منتخب نوادر عربی و فارسی کی نقول حاصل کی جائیں۔ مگر یہ کام بغیر حکومت کی اعانت کے سرانجام نہیں پا سکتا۔ اس لیے اہل علم کے لیے لازم ہے کہ حکومت پاکستان کی توجہ اس طرف منعطف کریں۔ تقریباً ۴۶ برس ہوئے مولانا شبلی مرحوم نے اپنے سفرنامۂ مصر و شام و روم میں اس تجویز پر بہت زور دیا تھا کہ قسطنطنیہ اور مصر سے کتابوں کی نقلیں منگوائی جائیں مگر اُس وقت حالات موافق نہ تھے اور یہ کام بہت مشکل تھا۔ آج اپنی حکومت ہے اور مائکروفلم نے اس کا فنی پہلو آسان کر دیا ہے۔ صرف احساسِ ضرورت اور توجہ اربابِ اختیار شرط ہے، تاکہ یہ تجویز عملی صورت اختیار کرے؛

فنونِ اسلام

کُوزہ و شیشہ

اسلامی ہُنروری کی تاریخ میں کُوزہ گری اور شیشہ سازی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دُنیا کی اور ثقافتوں کی طرح مختلف ممالک میں مسلمان ہنروروں پر ہمیشہ اُن کے پیشروؤں کا اثر بھی پڑا۔ لیکن جس صنعت کو مسلمانوں نے اختیار کیا اس پر اپنی صنّاعی کا خاص نقش بھی ثبت کیا۔ جس کی وجہ سے اس صنعت میں ایسی نمایاں کیفیت پیدا ہو گئی کہ ماہرانِ فن نے امتیازی طور پر اسے "اسلامی صنعت" کا نام دیا۔ مثلاً اسلامی فنون میں ہر صنعت میں چیزوں کی سطح کو نہایت زیبا اور دلکش طور پر آراستہ کیا جاتا ہے۔ یہ آرائش خالی سطح کو صرف پُر کرنے کی غرض سے نہیں کی جاتی، بلکہ اس آرائش کو کاریگر کے کام کی رُوح کہنا مناسب ہے، اِس لیئے کہ اس کے بغیر کاری گر اپنے کام کو بے جان اور بے روح تصوّر کرتا ہے۔ اب یہ فنِ عمارت ہو یا قالین بافی، کوزہ گری ہو یا شیشہ گری، قطعہ نویسی ہو یا تصویر سازی، آرائشی بیل بُوٹے بنائے گئے ہوں یا ہندسی اشکال، آرائش کاری ہر ہنر کے نمونوں کا لاینفک جزو اور اُن کے بنانے والوں کی طبیعت کا لازمی خاصّہ نظر آئے گی۔ اسی طرح اسلامی صنعت کاری کا ایک اور لازمی جزو عربی فارسی خط کا استعمال ہے۔ چنانچہ

مصنوعات پر عموماً کچھ کلمات کا نقش کرنا بھی اسلامی صنعت کے جوہر میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ گاہے کاریگر "عمل فلاں" کی شکل میں اپنا نام و مقام اور تاریخ لکھ دیتا ہے۔ گاہے وہ دعائیہ جملے اس شخص کے لیے لکھتا ہے جس کے لیے وہ چیز بنائی گئی ہو۔ کبھی وہ اس کے نام و القاب اور نشانِ خانوادگی بھی ثبت کر دیتا ہے۔ کبھی کوئی آیت یا حدیث یا مقولہ یا قطعہ یا رباعی یا بیت خوشخط لکھ دیتا ہے۔ جہاں تک کوزہ گری اور شیشہ گری کا تعلق ہے اس میں یہ دونوں وصف پائے جاتے ہیں، جن کا ذکر ہوا۔

کوزہ گری کی صنعت کے متعلق ایسا مواد جس سے معلوم ہو کہ مختلف ممالک اور ان کے صنعتی مرکزوں میں اس صنعت کا ارتقا کیونکر ہوا؟ موجود نہیں ہے۔ تاہم جو نمونے کھدائی سے فسطاطِ مصر، سامرا، مدائن (عراق)، شوش (خوزستان)، رے، نیشاپور اور سمرقند سے ملے ہیں، ان سے بعض نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مصر وغیرہ میں کوزہ گری کے فنی اور آرائشی اصول اسلام سے متصل پہلے نیم فراموشی کی حالت میں موجود تھے۔ انھیں اسلامی صنعت نے نئی زندگی بخشی اور ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ نیشاپور کے "تپۂ سبز پوشان" سے جو نمونے ملے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ڈیزائن یعنی تزئین کا نقشہ ساسانی عہد سے چلا آ رہا تھا۔ اسی طرح سمرقند کے اطراف سے جو نمونے حاصل ہوئے ہیں۔ ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سامانیوں کے زمانے میں ترکستان بلکہ چین کی صنعت کے ساتھ بھی اسلامی سلطنت کو ارتباط حاصل تھا۔ سبزی مائل نیلی ٹائلیں (فیروزہ نما؟) جو مصر میں اسلامی زمانے میں ملتی ہیں۔ اس ملک میں قدیم زمانے میں بھی پائی جاتی تھیں اور اسی طرح کی رنگا رنگ

کی ٹائلیں شوتش کے قصر دارا میں بھی ملتی ہیں۔ حاصل یہ کہ ان ممالک میں آرٹ کی دھندلی سی روایت کس مپرسی کی حالت میں موجود تو تھی، مگر اسلامی فتوحات کے بعد کوزہ گروں نے نئے نئے تجربے کر کے نئے نئے تزئینی نقشے نکالے اور فنی اعمال کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔ مٹی سے قاب (پلیٹ) اور رکابی، قدح اور کاسہ، پیالی اور گلدان، مرطبان اور ڈبیا، گھڑا اور لوٹا، صراحی اور بوتل طرح طرح کی چیزوں کو بڑے اور چھوٹے پیمانے پر کمال نزاکت اور لطافت کے ساتھ بنا کر ان کی اندرونی اور بیرونی سطح کو رنگوں اور پھول پتی سے زینت دی۔ ٹائلیں بنائیں اور ان کو کاشی کاری اور نقوش سے سجایا۔ اِن کاموں کو سرانجام دینے کے لیے گوناگوں فنی ترکیبیں استعمال کیں۔ مثلاً برتنوں پر اُبھرے ہوے بیل بوٹے بنا کر اُن پر کبھی یک رنگ مینا کاری کی، کبھی کندہ کاری کر کے آرائشی نقش بنائے اور ان پر رنگا رنگ کی مینا کاری کی، کبھی ان پر رنگ سے آرائش کی، یا ان پر زیرِ مینا نقاشی کی، یا ان پر لعاب کاری کی جسے انگریزی میں Lustreware کا کام کہتے ہیں، کبھی اُن پر بالائے مینا نقاشی کی یا پھر مینا کے بغیر ہی برتن بنائے ۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان اعمال میں سے لعاب کاری خصوصیت سے قابلِ توجہ ہے۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے مسلمان کاریگروں نے یہ عظیم الشان عمل ایجاد کیا۔ ڈاکٹر ڈیمانڈ Dimand نے ہمیں بتایا ہے کہ اس طرح کے برتنوں کو عموماً باریک زردی مائل مٹی سے بناتے تھے۔ پھر ان پر قلعی کا شفاف لعاب (انیمل) چڑھا کر بھٹی میں آگ دیتے تھے۔ بھٹی سے برتنوں کو نکالنے کے بعد معدنی اکسائڈ سے ان پر رنگ کر کے انھیں دوبارہ بھٹی میں رکھ کر آہستہ آہستہ پہلے سے مقابلۃً ہلکی آنچ دیتے تھے

دھوئیں سے آکسائڈ دھات کی پتلی سی تہہ کی شکل میں برتن کی سطح پر جم جاتا تھا۔ لعاب (انیمل) جو اس طرح سے بنتا تھا۔ اس کا رنگ سنہری ہوتا تھا، یا بھورا یا سرخ۔ نویں صدی عیسوی کے آخر تک کوزہ گروں نے اس صنعت میں کمال پیدا کر لیا تھا چنانچہ سامرا سے اس کے بہترین نمونے ملے ہیں، بعد کے زمانے میں لعاب کاری تو بہت ہوئی مگر خوبصورتی اور چمک جو سامرا کے نمونوں میں ملتی ہے وہ بعد کے زمانے کے برتنوں میں نہیں ملتی۔

ٹائل بنانے کا کام بھی بہت سے اسلامی ممالک میں ہوتا رہا۔ یہ ٹائلیں مستطیل شکل کی ہوتی تھیں، مگر مسدس ٹائلیں بھی ملتی ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں اٹلی کے دارالسلطنت روم میں ایرانی آرٹ کی نمائش میں بارہ پہلو کی ایک نہایت نفیس منقش ٹائل راقم نے دیکھی جو ۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء - ۱۲۶۷ء میں رَے میں بنائی گئی تھی، یہ ایلخانیوں کا زمانہ ہے۔ ٹائل میں چار مثمن تصویردار ستاروں کے حاشیے پر فارسی کی چند رباعیاں لکھی ہوئی ہیں، جن کا انداز خیّام کی رباعیوں کا سا ہے۔ مثلاً ؎

تا کی غم آں خورم کی دارم یا نہ ✽ ایں عمر بخوشدلی گذارم یا نہ
پُر کن قدح بادہ کہ معلوم نیست ✽ کین دم کہ فرو برم برآرم یا نہ

کاشی کاری کی ایسی ٹائلیں پندرھویں صدی اور بعد کے زمانے کی عمارتوں میں سلطنتِ عثمانیہ کے بعض مقامات، دمشق، ایران اور پاک و ہند میں بھی نظر آتی ہیں۔ لاہور اور ٹھٹھے میں اس کے نہایت دلکش نمونے موجود ہیں۔ ملتان میں کاشی کاری کا کچھ کام اب بھی ہوتا ہے۔ اور سندھ کے قصبۂ ہالا میں بھی قریب کے زمانے تک لُسٹر کا کام ہوتا تھا۔

مختصر یہ کہ قرونِ گزشتہ کے کوزہ گروں کے کام میں تین رنگ اور روشنی کی گہری حس کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ ان ہنروروں نے اپنی صنعت کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا کہ ماہرانِ فن آج تک عش عش کر رہے ہیں۔

اسلامی ہنروری کی جمالیاتی خصوصیتیں جو کوزہ گری کے ضمن میں بیان ہوئیں وہی شیشہ گری میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یعنی خالی سطحوں کو روشن اور خوشنما رنگوں اور بیل بوٹوں سے آراستہ کرنا اور عربی فارسی خطوں کو آرائشی ڈیزائنوں میں شامل کرنا۔ کوزہ گری کی طرح پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کو شیشہ گری کے طریقے اپنے پیشروؤں سے ورثے میں ملے۔ رومیوں کے زمانے میں بھی مصر و شام شیشہ گری کے لیے مشہور تھے۔ اسی طرح ایران میں شیشہ گری کی ساسانی روایت موجود تھی مگر مسلمانوں نے قدماء کی روایتِ فن کاری کو قبول کرنے کے بعد ہمیشہ اپنے تجربوں اور ذوق کی بنا پر اس روایت کو اوجِ ترقی پر پہنچایا۔ شیشہ گری کے متعلق اس دعوے کا ثبوت ان نمونوں سے ملتا ہے، جو سامرا سے ملے ہیں اور نویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں، یا مصر و شام اور عراق سے ملے ہیں۔ یا ایران کے شہروں شوش، رَے، ساوہ، اور نیشاپور سے ملے ہیں۔ ان میں سے اکثر آٹھویں نویں صدی سے متعلق ہیں اور عموماً بڑی اور چھوٹی عطر اور تیل کی بوتلوں، بَرانی (جمع برنی)، مرتبانوں، صراحیوں (یتیمۃ الدہر ۴: ۹۹ بعد، کے ساتھ مقابلہ کیجیے) اور پیالوں کی شکل میں ہیں۔ اکثر سادہ اور بعض رنگین نقش و نگار اور خطوط سے آراستہ ہیں۔ بعض آرائش دار شیشوں پر ٹھپوں سے قائم کیے ہوئے خطوط و دوائر اور جانوروں کی تصویریں بھی ملتی ہیں۔

شیشہ تراشی اور شیشے پر کندہ کاری کرنے کا فن بھی قدیم سے چلا آیا ہے، جو کبھی ہاتھ سے اور کبھی چرخ پر سرانجام دیا جاتا تھا۔ نیشاپور سے بعض شیشے کے برتن مثلاً پیالے، زمزمیاں اور کوزے ملے ہیں۔ جو نویں دسویں صدی عیسوی میں بنائے گئے اور اُن پر کندہ کاری سے آرائشی کام بنایا گیا۔ اس قسم کی کندہ کاری کے لیے جو شہر عہدِ عباسیہ میں مشہور ہوے ان میں بغداد بھی شامل تھا۔

دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں فاطمیہ مصر کے عہد میں شیشہ گری نے بڑی ترقی کی ۔ فسطاط اس صنعت کا بڑا مرکز تھا۔ اگرچہ فیوم اور اسکندریہ میں بھی شیشے کا کام بہت اچھا ہوتا تھا۔ شیشہ گری کے بہترین نمونے وہ ہیں، جو خود خلفائے فاطمیہ کے لیے تیار کیے گئے۔ ان میں ایک قسم کی صراحیاں بھی شامل ہیں جو دو حصوں میں بنتی تھیں۔ اوپر کا حصہ نیلا ہوتا تھا اور نیچے کا بے رنگ۔ شام کا شیشہ (زجاج الشام)، بقول ثعالبی رقت و صفا میں ضرب المثل تھا (ثمار القلوب طبع قاہرہ ص ۲۲۲) اور نہ صرف مصر، عراق، اناطولیہ اور ایران، بلکہ چین تک جاتا تھا۔ کاریگروں نے مصر و شام میں ایک خاص قسم کے شیشے پر استر یعنی بُراق لعاب یا انیل کی طرح رنگ چڑھائے۔ جس خاص قسم کے شیشے کا ذکر ہوا، وہ سنگِ سیاہ شیشہ گران یا مُغنیسیا (Manganese) سے بنتا تھا۔ اسی سنگِ سیاہ کی نسبت شاعر نے کہا ہے:۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ خمیر مایۂ دُکانِ شیشہ گر سنگ است

اس مصری لعاب کاری میں وہی رنگ استعمال میں آتے تھے جو کوزہ سازی میں مستعمل تھے۔ شیشہ سازی کے علاوہ ان صدیوں میں بلّور تراشی میں بھی کمال ترقی ہوئی اور فاطمیۂ مصر کے خزانوں میں تراشیدہ بلّور کی عجیب و غریب چیزیں موجود تھیں۔ جن میں سے چند

اب وینس، فلارنس، ویانا، لندن وغیرہ مقامات کے عجائب خانوں کی زینت ہیں۔

شیشہ گری کے عروج کا زمانہ سلاطین ایوبیہ اور ممالیک مصر کا زمانہ (بارھویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک) ہے۔ اس دور میں شیشے پر میناکاری اور طلاکاری کا فن اوج کمال پر پہنچا۔ حلب اور دمشق میں جو شیشہ اس دور میں بنا اس سے بہتر شیشہ دنیا نے نہیں دیکھا اور حلب کے شیشے نے تو دنیا میں دھومیں مچا دیں۔ گلستان سعدی کا ہوسناک تاجر فولادِ ہندی حلب کو لے جانا چاہتا ہے اور آبگینۂ حلبی یمن کو۔ عرفی کہتا ہے ؎

من چہ بودم حلبی شیشۂ لعلی صہبا　　پاسے کوبان بکجا بر سر سنداں رفتم

جب صلیبی شام میں پہنچے تو شیشے کے بہت سے نفیس برتن اپنے ساتھ یورپ لے گئے۔ ان میں سے بہت سے اب یورپ کے عجائب خانوں اور گرجوں میں محفوظ ہیں۔ اسی دور سے متعلق شیشے کے وہ چراغ ہیں جو ملوک سلاطین اور ان کے امراء نے قاہرہ کی مساجد کے لیے بنوائے تھے۔ ان میں سے متعدد قاہرہ کے عجائب خانے (دار الآثار العربیہ) میں محفوظ ہیں اور امریکہ اور یورپ میں بھی ان کی خاصی تعداد موجود ہے۔

ان چراغوں میں خوبصورت دائرے اور ان میں گُل بُوٹے بنائے جاتے تھے اور ان کی آرائش کے لیے سنہری رنگ اور سُرخ رنگ اور خوبصورت میناکاری استعمال میں آتی تھی۔ شام میں اسی طرح کی آرائش شیشے کی اور چیزوں پر بھی بناتے تھے۔ مثلاً صراحیوں، بوتلوں، رکابیوں اور پیالوں پر، جن میں انسانوں اور حیوانوں کی تصویریں بھی بنائی جاتی تھیں اور تقریباً ان کی ساری سطح کو رنگا رنگ کے خوبصورت نقشوں سے منقش و مزین کر دیتے تھے۔

یوں تو پندرھویں اور بعد کی صدیوں میں بھی شیشہ سازی ہوتی رہی، مگر کام کے عروج کا زمانہ گزر چکا تھا۔ شاہ عباس صفوی کے زمانے میں البتہ اِس صنعت کا احیاء ہوا اور اصفہان اور شیراز نے شیشہ گری میں نام پیدا کیا۔ چنانچہ محمد سعید اشرف نے کہا ؎

شیراز کہ پُرز شیشہ گرخانہ بود ٭ از باطنِ صافِ بادۂ شیراز یست

خواجہ آصفی (م ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء) کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "شیشۂ روزن" بھی بننے اور روشندانوں میں استعمال ہونے لگا تھا۔

کُوزہ گری اور شیشہ سازی ہمارے جمالیاتی ورثے کی گرانقدر چیزیں ہیں اور ان صنعتوں کا احیاء ہمارا ثقافتی فریضہ!

استانبول کے کتاب خانوں میں مرقّعات

استانبول کو "قلمی کتابوں کا شہر" کہتے ہیں۔ اس لیے کہ عربی، فارسی، ترکی کی قلمی کتابیں اور اوراق و اسناد جتنے اس شہر کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں، دُنیا کے کسی شہر میں نہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ استانبول کے مخطوطات کی تعداد ایک لاکھ ۳۵ ہزار ہے۔ جن میں سے سات سو کے قریب مصنفوں کے خود نوشتہ نسخے ہیں مخطوطات کی یہ تعداد پہلے اس سے بہت زیادہ تھی۔ ۱۸۸۲ء میں استانبول کے ایک فرانسیسی مجلے سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک لاکھ مخطوطات اُس زمانے کے صرف آٹھ کتاب خانوں میں موجود تھے۔ حالانکہ کتاب خانوں کی تعداد چالیس پچاس سے بھی زیادہ ہے۔ گویا بہت سے قلمی نسخے جو ان کتاب خانوں میں تھے اب نہیں ہیں۔ بعض لوگوں نے مستعار لیے اور واپس نہ کیے۔ بعض دست بدست ہوتے ہوئے یورپ کے کتابخانوں میں پہنچ گئے۔ کچھ حوادثِ زمانہ سے ضائع ہو گئے۔ مگر ان نقصانات کے بعد بھی صرف استانبول میں جو خزانے مخطوطات کے محفوظ ہیں، ان کی مثال دُنیا میں نہیں ملتی۔

استانبول کے اکثر کتاب خانے سقوطِ بغداد کے بعد وجود میں آئے۔ مگر ساتویں آٹھویں صدی کے کتاب خانے اب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں۔ ان کی کتابیں دوسرے کتاب خانوں میں منتقل ہو گئیں، جو اب موجود ہیں۔ اور جو نویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری تک وجود میں آئے۔ ان کتاب خانوں کے بانیوں میں سلطان محمد فاتح اور سلطان بایزید بن سلطان محمد فاتح کے نام دورِ اوّل میں اور سلطان محمود

اوّل کا نام دَورِ دوم میں بغایت احترام کے قابل ہیں کہ انھوں نے بے شمار کتابیں جمع کرائیں، مصنّفوں سے اُن کی تصنیفات کے نسخے حاصل کیے اور ان کو اشاعت کی غرض سے ملک کے مختلف کتاب خانوں کے لیے اپنے کاتبوں سے نقل کرایا۔ سلطان محمود اوّل نے عامّۃ النّاس کے لیے چار عمومی کتاب خانے قائم کیے۔ ان کی کتابوں پر سلطان موصوف کے وقف نامے اور اس کا طغرا درج ہے۔ اکثر کتاب خانے جامع مسجدوں کے اندر یا ان کی متصل عمارتوں میں ہیں۔ سلاطین کی تقلید میں وزیروں، امیروں اور عالموں نے بھی ذاتی کتابیں لوگوں کے فائدے کے لیے وقف کیں، کتاب خانوں کی مضبوط عمارتیں تعمیر کرائیں اور ان کے مصارف پورے کرنے کے لیے اوقاف مقرر کیے، جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی اب تک برقرار ہیں۔ اس وقت یہ سب کتاب خانے وزارتِ معارف کی نگرانی میں ہیں۔

ہم نے صرف استانبول کے کتاب خانوں کا ذکر کیا ہے۔ باقی ملک میں بھی بہت سے عمومی کتاب خانے ہیں اور فی الجملہ ان سب کی تعداد نوّے کے قریب ہے۔ استانبول کے کتاب خانوں کی فہرستیں شروع میں تو رجسٹروں کی صورت میں تھیں، ۱۸۸۲ء کے قریب مختصر سی فہرستیں مرتب کر کے چھاپ دی گئیں۔ مولانا شبلی جب ۱۸۹۲ء میں استانبول پہنچے تو ان کتاب خانوں کی زیارت بہت ذوق و شوق سے کی اور ان کے نوادر کا حال اپنے سفرنامے میں لکھا۔ بعد کے زمانے میں متعدد فضلا نے اپنی اپنی دلچسپی کے لحاظ سے ان کتاب خانوں کے بعض مخطوطات کی فہرستیں شائع کی ہیں۔ ان میں عثمان ارگین بک، پال ہارن، رٹر، ریشر، فیلکس ٹاور، شپینز، سوس ہائم، بلاؤ، شوکین، میکس کراؤزے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ امور آپ کی خدمت

ہیں اس لیے پیش کیے جا رہے ہیں کہ ہمارے ملک کے اساتذہ اور محققین کی توجہ اس عظیم الشان ذخیرے کی طرف جو استانبول میں موجود ہے منعطف کی جائے۔ ہم میں سے بہت ہی کم لوگوں نے ادھر توجہ کی ہے، حالانکہ وہ اہلِ تحقیق جو تاریخی اور ادبی امور کے متعلق کام، یا کسی نسخے کی تصحیح کر رہے ہیں، ہرگز ہرگز ان ذخائر سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

ہم نے چند گراں قدر کتاب خانوں کا ذکر ابھی کیا ہے۔ ان کے علاوہ بعض نادر مخطوطات کا ذخیرہ استانبول کے دو عجائب گھروں میں بھی ہے۔ یعنی آثار ترک و اسلام اور توپ قاپوسرا ے ہیں۔

ستمبر گزشتہ میں توپ قاپوسرا ے کے ذخائر میں سے صرف دو تین نادر کتابیں اور چار مرقعات کو تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہی ممکن ہو سکا۔ پرانی قلمی فہرستوں کے سرسری مطالعے سے ۳۷ مرقعات شمار میں آئے۔ مثلاً وہ مرقعے جو بایسنغر بن شاہرخ، شاہ طہماسب صفوی، بہرام مرزا، ابو الغازی ولی محمد بہادر خاں، علی شیر نوائی، سلطان حسین بایقرا نے مرتب کیے، یا ان کے لیے مرتب کیے گئے ـــ ان مرقعات میں کیا کیا بے بہا چیزیں موجود ہیں۔ اس کا تقریبی اندازہ اس ایک مرقع سے لگائیے، جس کا حال اب آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ان چار مرقعوں میں سے، جو میں نے سرسری دیکھے، میرزا بایسنغر، طہماسب صفوی اور بہرام میرزا کے مرقعے خصوصیت سے جالب نظر تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک ایک دیباچہ تھا جس میں خطوط مروجہ کے ارتقا کی تاریخ دی تھی، منشآت ابوالفضل میں جہانگیر کے مرقع کا جو دیباچہ درج ہے۔ اس کا اسلوب بعینہٖ

وہی ہے جو بایسنغر مرزا وغیرہ کے مرقعوں کا ہے، یعنی اس باب میں شیخ ابوالفضل اپنے پیشروؤں کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ ان دیباچوں کا نہایت قیمتی حصّہ وہ ہے جس میں انھوں نے اپنے معاصر یا اپنے سے قریب کے زمانے کے خطّاطوں کا ذکر کیا ہے۔ میرزا بایسنغر بن شاہرخ، بن تیمور (م ۸۳۷ھ) کا زمانہ چونکہ ہم سے نسبتاً زیادہ دُور ہے اس کا مرقع اس دَور کے ثقافتی حالات سمجھنے کے لیے بےحد مفید ہے۔ اس میں ایسے خطاطوں اور مصوّروں کا کام نظر آتا ہے جن کا نام بھی نہ سُنا تھا اور اگر نام سُنا تھا تو ان کے کام کے دیکھنے کی کوئی صُورت پیدا نہ ہوئی تھی۔

میرزا بایسنغر بہت ہُنرمند شہزادہ تھا۔ کتاب دوست اور اپنے زمانے کا درجۂ اوّل کا خطّاط، وہ ثلث اور نسخ دونوں خط بہت خوب لکھتا تھا۔ ایران و توران کے خوش نویس اس نے اپنے دربار میں جمع کیے تھے۔ اس کے مرقع کی جو ۹۸ ورق پر مشتمل ہے تقطیع بہت بڑی ہے۔ ہر ورق کا طول ۶۸ سنٹی میٹر اور عرض ۴۸.۰ سنٹی میٹر ہے۔ اس میں مہر شدہ دبیز، خان بالیغی کاغذ پر خط اور تصویر کے چھوٹے بڑے کئی سو نادر نمونے کمال کاریگری سے چسپاں کیے گئے ہیں۔ اس مرقع کے نصف اوّل میں بیشتر خطاطی کے نمونے ہیں اور نصف آخر میں تصویری نمونے۔ پہلے حصّے میں بعض جلی اور خفی نمونے خود بایسنغر کے خط میں ہیں۔ ایک قطعہ اس کے بھائی ابراہیم سلطان کے خط میں ہے۔ ایک قطعہ خلیل سلطان (غالباً ابن میرانشاہ بن تیمور) کے خط میں ہے۔ ایک جدّت مرقع کے اس حصے میں یہ نظر آئی کہ " بانشگیِ تدوم النعم " کا جملہ ۱۶ خطاط نے دو تین صفحوں پر ایک دوسرے کے مقابلے میں لکھا ہے۔ جن میں سے ۱۴

خطّاطوں کے نام بھی دیے ہیں۔ ان میں میرزا بایسنغر اور فرید الدین جعفر خطّاطِ مشہور کے نام بھی شامل ہیں۔

اس مرقع میں کُوفی، ثُلث، تعلیق، دیوانی اور نسخی کے کئی نمونے شامل ہیں۔ ایک نفیس نسخی کتبہ "یوسف مذہّب" شاگرد بہزاد نے لکھا ہے، ایک جلی ثُلث کا کتبہ محمد بن حیدر الحسینی نے لکھا ہے، جس پر محرّم ۸۱۷ھ کی تاریخ دی ہے۔ ایک قطعہ "نور الدین العادل البغدادی عبد خلیل سلطان العادل الہادی" نے لکھا ہے۔ ایک عربی عبارت جلی نسخی میں الٹی لکھی ہے، جیسے اس زمانے میں سنگساز اُلٹا لکھتے ہیں۔ ایک اور جدّت اس مرقع میں یہ ہے کہ آلِ چنگیز کا شجرۂ نسب چنگیز سے لے کر اپنے زمانے تک دیا ہے۔ اس طرح سے کہ شجرے میں گول دائرے بنائے ہیں، اور ہر دائرے میں نام کے بجائے اس شخص کی سیاہ قلم تصویر دی ہے۔ فقط چنگیز خان اور تیمور کی تصویریں رنگین ہیں۔ اس میں تیمور، شاہرُخ اور بایسنغر اور اس کے بھائیوں کی تصویروں کو بہت ہی معتبر سمجھنا چاہیے۔ ان تصویروں پر نام بھی دیے ہیں۔ شجرے کے اوپر کے حصے میں یہ نام اویغوری خط میں بھی دیے گئے ہیں۔ جن سے مغولی ناموں کا صحیح تلفّظ معلوم ہوتا ہے۔ تصویروں میں شبِ معراج کی مشہور تصویر بھی شامل ہے جو اُس دَور میں اور کتابوں میں بھی ملتی ہے۔ چنانچہ میگیوں کی کتاب Manuel Migeon جلد ۲ ص ۱۳ پر اسی موضوع پر دو[۲] تصویریں دی ہیں جو ہرات ہی میں بنائی گئی تھیں۔ بعد کے زمانے میں یہ تصویر جابجا ملتی ہے۔ اسی حصے میں متعدد سیاہ قلم تصویریں انسانوں اور حیوانی اور نباتاتی اشیاء کی موجود ہیں۔ بعض مردوں کی رنگین تصویریں ایسی صفائی سے اور اتنے روشن

رنگوں میں بنائی گئی ہیں کہ فرنگی نقاشی کو مات کرتی ہیں۔ ایک شہزادے کی تصویر کے نیچے لکھا ہے: "جاوید باد وجاہت جان آفرین پناہت"۔ شاید یہ شہزادہ بایسنغر کی تصویر ہو۔ باز کی ایک تصویر پر مغولی میں چند سطریں لکھی ہیں۔ خرگوشوں وغیرہ کی چند کمال خوبصورت تصویریں دی ہیں۔ تصویروں پر نقاشوں کے نام بہت کم دیے ہیں۔ ایک تصویر پر "کارِ جلال" لکھا ہے۔ ایک پر ہے: "قلم کمترین بندگان محمد بن محمود شاہ خیام"۔ یہ خیام کاتب بھی ہے اور نقاش بھی۔ قیاس فرمایئے کہ شہزادہ بایسنغر نے کتنی تگ و دو اور صرفِ کثیر سے اپنے اور اپنے زمانے سے صدیوں پہلے کے نایاب نوادر اقطارِ عالم سے فراہم کر کے یکجا کیے ہوں گے اور ان کے یکجا ہونے سے یہ مجموعہ کیسی گراں بہا چیز بن گیا ہے۔

اب بہرام مرزا کے مرقع کا حال سنیے۔ ابوالفتح بہرام مرزا (م ۹۵۷ھ) شاہ اسمٰعیل صفوی کا چوتھا بیٹا تھا، جس نے یہ نہایت دلچسپ مرقع مرتب کیا، جس میں اس نے خط اور تصویر کے نادر و نایاب اور نہایت قیمتی نمونے جمع کیے۔ اس کے مرقع کے ہر صفحے سے اس کی غیر معمولی خوش ذوقی نمایاں ہوتی ہے۔ اس کا بھائی سام میرزا "تحفۂ سامی" (ص ۹) میں ہمیں بتاتا ہے کہ بہرام میرزا خود بھی فنونِ نفیسہ میں مہارت رکھتا تھا۔ "معمورہ طرّاحی" City Planning شعر اور معمایں بے مثال تھا، اسے موسیقی میں بھی دخل تھا اور خطوط خصوصاً نستعلیق میں اس کی قابلیت نمایاں تھی۔ اس کے مرقع میں اس کے خط کا نمونہ بھی دیا ہے اور اس کی تصویر بھی موجود ہے۔ یہ مرقع بڑی تقطیع کے تقریباً ۱۵ ورق پر ختم ہوا ہے

شروع میں حسب معمول مرقع کا دیباچہ دیا ہے، جو نو ورق میں آیا ہے۔ جس میں خط کے ارتقار کی تاریخ دی ہے۔ خطوط کے نمونے جو اس میں جمع ہیں، وہ آلِ تیمور سے لے کر ابتدائی عہدِ صفویہ تک تقریباً ۱۵۰ سال کے بہترین نمونے ہیں۔ یہ دَور خصوصیت سے نستعلیق کے تدریجی کمال کا دَور ہے۔

نہایت سربرآوردہ خطّاط جن کے خطوط اِس مرقع میں شامل ہیں، چار ہیں:-

جعفر تبریزی جو بایسنغر بن شاہرخ کے اور اظہر جو سلطان ابوسعید گورکان کے کتاب خانے میں ملازم تھا سلطان علی مشہدی اور شیخ بایزید پورانی جو اظہر کا شاگرد ہے۔

جعفر کے ایک کتبے پر ۸۳۷ھ اور سلطان علی کے ایک نمونے پر ۹۰۰ھ تاریخ دی ہے۔ سلطان علی کے خط میں مولانا جامی کا ایک رسالہ بھی ہے، جس میں ۴۰ حدیثوں کا منظوم ترجمہ دیا ہے۔ مولانا نے اسے ۸۸۶ھ میں تمام کیا اور سلطان علی نے اسے ۸۹۷ھ میں نقل کیا۔

سلطان علی کے شاگردوں اور اس کے شاگردوں کے شاگردوں کے بیشمار کتبے اس مرقع میں ہیں۔ دبستانِ ہرات کے علاوہ دبستانِ عراق و نیشاپور کے کئی خوش نویسوں کی تحریریں بھی اس میں موجود ہیں۔

اس مرقع کی تصویریں خطّاطی کے نمونوں سے بھی زیادہ نایاب ہیں، لطف یہ کہ اکثر تصویروں پر مصوّروں کے نام بھی دیے ہیں۔ گو تین نہایت نادر تصویروں پر جو چینی مصوّروں کے قلم کی ہیں، صرف یہ لکھا ہے:- "کارِ استادانِ ختائی" یا

"از کارہائے خوبِ استادانِ خطائی" ——— مشہور ترین مصوّر جن کا نایاب کام اِس مرقع میں شامل ہے تین ہیں:۔ میرک، شاہ مظفر اور بہزاد۔

ایک سیاہ قلم تصویر پر لکھا ہے:۔ "قلم سیاہی استاد میرک استادِ بہزاد" شاہ مظفر کی نسبت میرزا حیدر دوغلات نے لکھا ہے کہ وہ ۲۴ سال کی عمر میں مر گیا اور اس نے ساری عمر میں سات آٹھ مجلسیں تمام کیں، جو اُس زمانے میں بھی نہایت نایاب تھیں۔ اس مرقع میں اس کی دو تصویریں ہیں، ایک مجلس اور ایک سیاہ قلم۔ اسکندر منشی نے شاہ مظفر کو "مصوّرِ خوب" اور "طرّاحِ بے عدیل" لکھا ہے اور کہا ہے کہ شاہ طہماسپ کے محل کی تصویریں اس نے بنائیں اور اصفہان کے ایوان چہل ستون کی مجلس کی طرّاحی اس نے کی۔

بہزاد کی چار تصویریں اس مرقع میں ہیں۔ ایک میں ایک قلندر اور شیر بنایا ہے، ایک میں باز۔ ایک تصویر پر لکھا ہے "طرح استاد بہزاد" ایک پر اس کا نام یوں دیا ہے، "قلم کمترین حضرت نادرۃ العصر استاد کمال الدین بہزاد"

جن دو مرقعوں کا مجمل ذکر آپ نے سنا وہ اپنے اپنے دَور کی ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ جیسا ابھی بیان ہوا اس قسم کے نوادرِ عالم کے عجیب و غریب مجموعے استانبول کے ایک ذخیرے میں کم از کم ۲۷ ہیں، جن کے بغیر اس دَور میں خط و تصویر کے ارتقاء کی تاریخ سمجھی ہی نہیں جا سکتی۔ اس سے استانبول کے کتاب خانوں کی بے نظیر ثروت کا اندازہ لگانا چاہیے۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

مسلمانوں کا فکری نظام اخلاق

علمِ اخلاق کی تعریف طاش کوپری زادہ نے مفتاح السعادۃ میں یوں کی ہے کہ:-

"علمِ اخلاق وہ علم ہے، جس سے مختلف قسم کے فضائل کی پہچان حاصل ہوتی ہے۔"

پھر کہا ہے کہ:-

"قوتِ نظریہ، غضبیہ اور شہویہ اِن تینوں قوتوں کے اعتدال کو فضائل کہتے ہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اس فاضل کے نزدیک موضوعِ علم اخلاق ملکاتِ نفسانیہ ہیں، جن کی افراط و تفریط میں اعتدال پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس علم سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال میں حتی الامکان کامل بنتا ہے، تاکہ دنیا میں سعید ہو اور آخرت میں حمید۔

فضائل و رذائل کے باقاعدہ مطالعے پر علم اخلاق میں زور دیا جاتا ہے۔ بہت سی کتابیں جو عربی فارسی میں علم اخلاق پر لکھی گئیں ان میں یونانیوں کے فلسفے اور اسلامی اخلاق و آدابِ حسنہ کی تعلیم کی آمیزش نظر آتی ہے۔ مثلاً حصولِ سعادت، اخلاق کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ یہی تعلیم ارسطو اور افلاطون نے بھی دی۔ اسی طرح ان کتابوں میں قوائے نفسانی کی تجزی کی گئی ہے۔ ہر قوت کے ساتھ اس

کی فضیلت بنا کر اس کے طرفین میں افراط و تفریط کو قائم کیا ہے۔ اس شکل میں یہ وَسَط کا مسئلہ یونانی مسئلہ بھی ہے، لیکن اگرچہ بنو العبّاس کے ابتدائی دَور میں اس زمانے کے تقاضے کے مطابق اسلامی تعلیمات اور یونانی حکمار کی تعلیمات میں تطبیق پر اہلِ علم نے بہت زور مارا، تاہم تعلیمِ اخلاق کی جان اسلامی تعلیمات ہی تھیں، وہ تعلیمات جن کا منبع قرآنِ مجید ہے۔ یوں تو کلامِ پاک میں جا بجا اخلاقِ حسنہ پر بہت زور دیا گیا ہے مگر سُورۂ بنی اسرائیل میں ان تعلیمات کو بہت خوبصورتی سے جمع کیا گیا ہے، ارشاد ہوا ہے:۔

"(اے پیغمبر) خدا کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنانا، ورنہ تم ایسے (بدحال) بیٹھے رہ جاؤ گے (کہ خدا اور فرشتے اور ایمان والے سب) تمھیں نفرین کریں گے اور تمھیں (تنہا بے پناہ) چھوڑ بیٹھیں گے اور تمہارے پروردگار نے حکمِ قطعی دے دیا ہے کہ (لوگو!) اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا (اے مخاطب)، اگر والدین میں کا ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو اُن کے آگے ہُوں بھی نہ کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے (کچھ) کہنا (سننا ہو تو) ادب کے ساتھ کہنا (سننا) اور محبت سے خاکساری کا پہلو ان کے آگے جھکائے رکھنا اور (ان کے حق میں) دُعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار، جس طرح انھوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا (اور میرے حال پر رحم کرتے رہے) اسی

طرح تُو بھی ان (دونوں) پر (اپنا) رحم کیجیو۔ (لوگو!) تمھارے
دل کی بات کو تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے۔ اگر تم (حقیقت میں)
سعادت مند ہو (اور تم سے ماں باپ کے حق میں بھولے سے کوئی
فروگذاشت بھی ہوگئی ہوگی) تو (وہ تمھیں معاف کر دے گا۔ کیونکہ)
وہ توبہ کرنے والوں (کی خطاؤں) کا بخشنے والا ہے اور رشتہ دار
اور غریب اور مسافر (ہر ایک کو) اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت
کو) بے جا مت اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بے جا اڑانے والے
شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکر
ہے اور اگر تمھیں اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو
توقع ہو (مجبوری) ان (غربا) سے منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے انھیں
سمجھا دو اور اپنا ہاتھ اتنا نہ سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور
نہ بالکل اسے پھیلا ہی دو۔ (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے
کہ لوگ تمھیں ملامت بھی کریں گے (اور) تم تہی دست بھی ہو گے۔
(اے پیغمبر!) تمھارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا
ہے اور جس کی روزی چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے (اور) وہ اپنے
بندوں (کے حال) سے باخبر (اور ان کی ضرورتوں کا) دیکھنے والا ہے"
اور (لوگو!) افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ انھیں اور
تمھیں ہمیں روزی دیتے ہیں۔ اولاد کا جان سے مار ڈالنا بڑا بھاری گناہ
ہے اور بدکاری کے پاس (ہو کر بھی) نہ پھٹکنا، کیونکہ وہ بے حیائی ہے

اور (بہت ہی) بُرا چلن ہے اور (کسی کی) جان کو جس کا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے، ناحق قتل نہ کرنا، اور جو شخص ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے والی (وارث) کو (قاتل سے قصاص لینے کا) اختیار دیا ہے تو اس کو چاہیئے کہ خون (کا بدلہ لینے) میں زیادتی نہ کرے ، کیونکہ (وہ ابھی بدلہ لینے میں بھی) اُسی کی جیت ہے اور جب تک یتیم اپنی جوانی کو نہ پہنچ لے، اس کے مال کے پاس بھی نہ جانا مگر ایسی طرح پر کہ یتیم کے حق میں بہتر ہو اور عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ (قیامت) میں عہد کی باز پُرس ہو گی اور جب ناپ کر دو تو پیمانے کو پورا بھر کر دیا کرو، اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملے) کا یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے' اور (اے مخاطب!) جس بات کا تجھے علم یقینی نہیں (اٹکل پچو) اس کے پیچھے نہ ہو لیا کر 'کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے (قیامت کے دن) پوچھ گچھ ہونا ہے اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر، کیونکہ (اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو پھاڑ نہیں سکے گا، نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔" (اے پیغمبر!) ان سب باتوں میں جو جو بُری ہیں سب ہی تمہارے پروردگار کے نزدیک ناپسند ہیں۔"

یہی وہ بنیادی باتیں ہیں جن پر اسلامی علم اخلاق کی عمارت کھڑی ہوئی۔ خصوصاً امام محمدؒ غزالیؒ کے ہاں جنھوں نے اپنے آپ کو بہت حد تک سلف صالحین کا پیرو بنایا

فلسفیوں کے کلام کی روح سے مجادلہ کیا، غزالی کی تواں تجزی ان کے بالغ اور دُور رس افکار، ان کے شدید تأثرات اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نفوس کی صحیح رہنمائی پر قدرتِ تامّہ رکھتے ہیں، اس سے پیشتر کہ اخلاق کے متعلق ہم امام موصوف کے نظریے پیش کریں، اُن کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں، تاکہ ان کی تعلیمات کا پس منظر معلوم ہو۔

غزالی ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے۔ یہ سلجوقیوں کا زمانہ تھا اور اسی زمانے میں ان کا وزیر نظام الملک ایک زبردست اور دیرپا علمی تحریک کا نقشہ اپنے ذہن میں تیار کر رہا تھا، چنانچہ ۴۵۷ھ میں اس نے بغداد میں پہلا مدرسۂ نظامیہ قائم کیا۔ پھر نیشاپور اور دوسرے شہروں میں بھی دیگر مدارس قائم کیے۔ ان مدارس کے فارغ التحصیلوں کو فوراً بڑے بڑے سرکاری عہدے ملنے لگے اور دنیاوی اغراض کے لالچ میں طلبہ امنڈ کر ان مدارس کی طرف آنے لگے۔ غزالی نے بھی تعلیم تو اسی دور میں پائی، مگر رحمتِ ایزدی نے ان کی دستگیری کی۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بسترِ مرگ پر انھوں نے محمدؐ غزالی اور ان کے بھائی احمدؒ کو ایک صوفی دوست کے سپرد کیا۔ جس کے زیرِ اثر ان کی ابتدائی تعلیم میں روحانیت کا جُزو بھی شامل ہوا۔ اپنے فقر اور تجرید سے مجبور ہو کر صوفی مذکور نے کچھ عرصے کے بعد دونوں بھائیوں کو ایک مدرسے میں داخل کرا دیا، جہاں سے ان کو قوت ملنے لگا اور تعلیم جاری رہی۔ مگر غزالی کی نظر اپنے ہمعصر طالب علموں کے برعکس اس دنیا سے آگے بھی جانے لگی۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ "ہم نے علم پڑھا تو غیر اللہ کے لیے مگر اللہ نے اِس سے اِبا کیا کہ سوا اس کے کسی اور مطلوب کے لیے ہم علم حاصل کریں۔"

طالب علمی کا دور ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ان کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ چنانچہ نظام الملک نے ان کو اپنے دربار میں بُلا لیا اور چھٹے سال کے بعد ۴۸۴ھ میں انھیں نظامیہ بغداد میں خدمتِ تدریس سپرد کی۔ چار سال تک وہ نہایت کامیابی کے ساتھ فرائضِ تدریس انجام دیتے رہے اور انھیں "امامِ خراسان" اور "امامِ عراق" کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ مگر جہاں ایک طرف گنبدِ افلاک ان کے علم وفضل اور کمالات کی شہرت سے گونج اٹھا تھا، دوسری طرف وہ ایک عظیم الشان روحانی انقلاب، ایک گہری اندرونی بے چینی سے دوچار ہو چکے تھے۔ جس نے ان پر خور وخواب کو محال بنا دیا تھا۔ جس نے ان کا زاویۂ نگاہ اس طرح بدل دیا تھا کہ انھوں نے اپنے آپ کو ترکِ علائق پر مجبور پایا' انھوں نے بغداد کو خیر باد کہا اور دس برس تک شام، فلسطین اور مصر میں درویشوں کی طرح گھومتے پھرے۔ غزالی کے شاگردِ رشید قاضی ابوبکر ابن العربی، فقیہہ مالکی روایت کرتے ہیں کہ:۔

"میں غزالی سے دشت میں ملا، وہ جامۂ مرقع میں ملبوس تھے، ہاتھ میں مشکیزہ اور سنان دار عصا تھا"۔ میں نے عرض کیا: "بغداد کا درسِ علم کیا اس سے بہتر نہ تھا؟"۔۔۔ انھوں نے دنبالِ چشم سے میری طرف دیکھا اور فرمایا:۔ "جب سعادت کا بدر ارادے کے آسمان پر تاباں ہوا اور اصول کا سورج معارف وصول کی طرف مائل ہُوا تو میں نے لیلی اور سُعدیٰ کے عشق کو ترک کیا اور پہلی منزل کی تصحیح کی طرف عود کیا اور شوق نے مجھے پکارا کہ ٹھہر جا، کیونکہ جسے تُو چاہتا ہے اس کے منازل یہی ہیں۔ پس رک جا اور یہیں منزل کر۔

تَرَکْتُ ھَوَی لَیلَی وَسُعْدَی بِمَعْزِلٍ ٭ وَعُدْتُ اِلَی تَصْحِیْحِ اَوَّلِ مَنْزِلٍ

وَنَادَتْ بِیَ الْاَشْوَاقُ مَھْلاً فَھٰذِہٖ ٭ مَنَازِلُ مَنْ تَھْوَی رُوَیْدَکَ فَانْزِلٖ

اسی زمانے میں وہ دمشق میں چند سے مقیم بھی ہو گئے اور احیاء العلوم اور دوسری کتابیں تصنیف کیں۔ ۴۹۹ھ میں وہ نیشاپور میں آ کر نظامیہ میں دوبارہ تدریس میں مشغول ہو گئے۔ گو اب ان کا نقطۂ نظر بالکل بدل چکا تھا، دو سال سے کم مدت انھوں نے یہاں گزاری اس کے بعد اپنے وطن طوس کی طرف لوٹ گئے اور وہیں ۵۰۵ھ میں انتقال فرمایا۔ جب ان کا وقت قریب آیا تو انھوں نے وضو کیا، نماز پڑھی، کفن طلب کیا، اسے لے کر آنکھوں سے لگایا اور کہا:- "بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونے کا حکم مجھے پہنچا۔ میں اس حکم کو بجا لاتا ہوں" ؎

اَلْقَی الصَّحِیْفَۃَ کَیْ یُخَفِّفَ رَحْلَہٗ ٭ وَالزَّادَ حَتّٰی نَعْلَہٗ اَلْقَاھَا

یوں تو امام غزالی نے اخلاقیات پر اپنی کتابوں میں جا بجا بہت کچھ لکھا ہے، مگر ان کا ایک چھوٹا سا رسالہ مصر میں طبع ہوا ہے، جس کا نام انھوں نے "القواعد العشرہ" رکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی اخلاقی تعلیمات کا خلاصہ درج کیا ہے۔ اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ ہمارے طریقے کی کیفیت اور ہماری اصل تحقیق کی دلیل دس قاعدوں پر مبنی ہے جو سونے والے کو جگاتے ہیں اور بیٹھے ہوئے کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان قاعدوں پر ہم اس بیان کو ختم کرتے ہیں۔

پہلا قاعدہ نیتِ صادقہ ہے جو بغیر سستی اور کاہلی کے واقع ہو نیت

سے مراد دِلی عزم ہے اور نیتِ صادقہ سے مراد وہ دلی عزم جس سے کام کے لیے آمادگی ظاہر ہو اور جو باقی معاملے کو خدا پر چھوڑ دے اور بغیر سستی اور کاہلی کے وقوع میں آنے سے مراد یہ ہے کہ دل اس اچھے ارادے پر مستقلاً قائم ہو کیونکہ تکرار میں جو تاثیر ہے وہ بدون تکرار حاصل نہیں ہوتی اور اس نیّتِ صادقہ کی علامت یہ ہے کہ دُنیا کی فانی چیزوں کی وجہ سے اپنا عزم نہ بدلا جائے، اس لیے کہ عمل حق کے لیے ہوتا ہے اور حق سے کوئی چارہ نہیں۔ لہٰذا جس بات کا عزم کر لیا جائے اُسے خلقت کے لیے چھوڑا نہیں جا سکتا۔

دُوسرا قاعدہ خالصتہً للہ عمل ہے، جس میں نہ کوئی اور شریک ہو، نہ کسی اور کا اشتراک ہو، حضورؐ نے فرمایا: " اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ اور ایسے عمل کی علامت یہ ہے کہ آدمی سچ کے سوا کسی چیز سے راضی نہ ہو اور سچ کے سوا ہر چیز کو بے کار جانے"۔ حضورؐ نے فرمایا: " دُنیا کے غلام کے لیے ہلاکت ہو! اس لیے خلق سے اجتناب لازم ہے اور ہمیں اپنی تمام آرزوئیں اللہ پاک کے لیے ترک کر دینی چاہییں"۔ حضورؐ نے فرمایا: " ایک آدمی کے اسلام کی درستی میں یہ امر شامل ہے کہ جو چیز اس کے لیے اہم نہیں اُسے چھوڑ دے"۔ اور ان غیر اہم چیزوں میں شبہات بھی شامل ہیں۔ پس شبہات کی زد سے بچو کہ حضورؐ نے فرمایا: " جو چیز تمھیں شک میں ڈالے اُسے چھوڑ دو اور اسے اختیار کرو، جو تمھیں شک میں نہ ڈالے۔ اگر یہ تین اصول درست ہو گئے تو تم کو ان کا پھل ملے گا۔ یعنی قربِ خداوندی اور تم ظاہری اعتبار سے تو دنیا میں، مگر معنوی اعتبار سے

وجھ ہلکا رکھتا ہو، اس لیے کہ وہ اجنبی سرزمین میں رہتا ہے اور دُنیا کی
دِں یعنی مال و منال اور ساز و سامان سے الفت نہ رکھتا ہو۔ مسافر کی
ہے کہ وہ بعجلت جواب دے اور جو کچھ اس کو ملے اس پر راضی ہو
پسندیدہ سمجھے۔ اور میّت کی علامت یہ ہے کہ وہ مہمّاتِ دین کو
نیا پر ترجیح دے۔

یسرا قاعدہ یہ ہے کہ حق سے کلّی موافقت رکھے اور ترکِ عیش و
ور سختی کشی پر صبر کر کے نفس کی مخالفت کرے جس نے اس کی عادت
حجاب سے نکل آیا اور اس نے حق کو رُو در رُو دیکھا، اس کی نیند بیداری
ی مجلس عزلت میں، اس کی سیری بھوک میں، اس کا طمطراق شکستگی میں،
و خاموشی میں اور اس کی کثرت قلت میں بدل گئی۔"

چوتھا قاعدہ یہ ہے کہ اتّباع پر عامل ہو، نہ ابتداع پر تاکہ اپنی رائے
الا اور اس پر اکڑنے والا نہ بن جائے۔

پانچواں قاعدہ۔ ہمّت بلند ہو، جو تاخیر اور ٹالم ٹول سے بری ہو،
رمایا گیا ہے: "آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔"

میں سستی کی جائے اور کوشش چھوڑ دی جائے، بلکہ یہ کہ تسلیم کیا جائے کہ بغیر اللہ پاک کی قدرت کے تم ہر فعل سے عاجز ہو، ذلت و شکستگی سے مراد یہ ہے کہ تم خلقِ خدا کو توقیر اور احترام کی نظر سے دیکھو۔

ساتواں قاعدہ خوف و رجا کا ہے جو بیک وقت موجود ہو۔

آٹھواں قاعدہ درود و وظائف کی مداومت ہے، جس سے روحانی امداد حاصل ہوتی ہے۔

نواں قاعدہ۔ مراقبے کی مداومت ہے، جس نے دل کے مراقبے کی مداومت کی اور غیر اللہ کو دل سے دُور کیا، وہ اللہ اور اس کے احسان کو پالے گا۔ اور علم یقین سے یہ سب کچھ حاصل ہو گا۔ یعنی یہ سمجھنے سے کہ حرکات و سکنات و اعیان خدا کی تحریک و تسکین و قدرت سے وجود میں آتے ہیں اور کوئی چیز اس سے مستغنی نہیں، اس کے بعد مزید مراقبے سے تم عین الیقین تک ترقی کر جاتے ہو اور حقیقتِ یقین حاصل کرتے ہو اور کہتے ہو میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی، مگر یہ کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے مشہود و حضور سے دیکھا کہ وہ اپنی قیومیت کی وجہ سے ہر چیز کا قیوم ہے اور ہر چیز اس کے امر اور قدرت سے قائم ہے، پس خلقِ خدا سے ادب کے ساتھ پیش آؤ اور حسنِ معاشرت کو مدِ نظر رکھو۔

دسواں قاعدہ وہ علم ہے، جس میں مشغول رہنے سے ظاہری اور باطنی کوششیں لازم آئیں اس لیے کہ جس نے یہ گمان کیا کہ وہ طاعت سے مستغنی ہوا وہ اخلاقی طور پر مفلس ہے۔

قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔

توحید و رسالت کے اعلان کا موقع، دوست و احباب کے درمیان میل ملاپ کی ایک صورت، غربا و مساکین میں خیرات و صدقات کی تقسیم کا ایک ذریعہ بنا دیا اور اُمّتِ مسلمہ کے لیے فلاحِ دارین کی ایسی صورتیں پیدا کر دیں، جس میں صرف روحانی پہلو ہی نہیں بہت سے عمرانی پہلو بھی شامل ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ عید الفطر پہلی شوّال کو اور عید الاضحیٰ ۱۰ر ذی الحجہ کو ہوتی ہے۔ دونوں عیدوں میں چند مشترک خصوصیتیں پائی جاتی ہیں، دونوں میں نمازِ عید پڑھی جاتی ہے۔ نمازِ عید کا ادا کرنا سنّت ہے اور اس میں تمام اُمّت شامل ہوتی ہے۔ اس نماز کی صورت باقی نمازوں سے سادہ تر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں نہ اذان دی جاتی ہے اور نہ اقامت کہی جاتی ہے۔ خطبہ عموماً نماز کے بعد ہوتا ہے۔ عید کی نماز، جس کا وقت طلوع اور زوالِ آفتاب کے درمیان ہوتا ہے عام طور پر شہر سے باہر کھُلی جگہ پڑھی جاتی ہے، جسے مصلّٰی یا عید گاہ کہتے ہیں۔ گو عام مساجد میں بھی عید پڑھ لیتے ہیں، قوم کی وحدت اور ہم آہنگی کا وہ منظر جو عیدین پر نظر آتا ہے، اپنے تو اپنے، بیگانے بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ کعبے کی طرف مُنہ کرکے، افرادِ ملّت کا کثیر حصّہ صف بہ صف جمع ہو کر ضبط و نظم کے ساتھ، غیر اللہ سے روگردان ہو کر، عبادتِ الٰہی میں منہمک، رکوع و سجود میں مشغول اور دعاؤں میں شریک ہوتا ہے۔ یہ منظر حقیقتاً نہایت ہی ایمان افروز ہوتا ہے۔

عید کے موقع پر لوگ نہا دھو کر کپڑے پہنتے ہیں۔ کسی کو نئے میسّر نہ ہوں تو جو اسے میسّر ہو اسی میں سے بہترین لباس میں ملبوس ہونے پر کفایت کرتا ہے لوگ

اس تقریب سے گھر بار کو صاف ستھرا کر کے ایک دُوسرے کی ملاقات کے لیے جاتے ہیں۔ ایک دُوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں، ایک دُوسرے کے ہاں تحائف بھیجتے ہیں، دوستوں کی مہمانی کرتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ بچوں کو نئے کپڑے پہناتے ہیں، انھیں کھلونے خرید کر دیتے ہیں۔ بستیوں کی رونق میں اضافہ ہوتا ہے اشیائے خورد و نوش، زیب و زینت، لباس اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی تجارت میں نمایاں ترقی ہوتی ہے، بعض اسلامی ممالک میں یہ بھی دستور ہے کہ لوگ عید کے دن زیارتِ قبور کے لیے جاتے ہیں۔ فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور گھنٹوں وہاں ٹھہرتے ہیں، بلکہ خیمے لگا کر رات ان خیموں میں بسر کرتے ہیں۔

عید الاَضحیٰ کو عیدِ قربان یا بڑی عید یا بقر (بکر) عید بھی کہتے ہیں۔ اَضحیٰ اَضحاۃ کی جمع ہے اور معنی ضَحِیّہ ہے، یعنی قربانی کی بھیڑ بکری۔ اِس عید کو "عید الضّحیٰ" کہنا غلط ہے۔ ۱۰ ذی الحجہ وہ دن ہے جس میں حاجی وادی مِنیٰ میں قربانی کرتے ہیں اور اس کے تین دن بعد تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان دنوں کو ایّامِ تشریق کہتے ہیں۔ قربانی صرف حاجیوں ہی کے لیے واجب نہیں، ہر اُس آزاد مقیم مسلمان پہ واجب ہے جو قربانی کے لیے جانور خریدنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

بھیڑ، بکری ہر شخص کی طرف سے ایک ذبح کی جاتی ہے۔ اونٹ یا گائے وغیرہ کی قربانی میں ایک سے سات آدمی تک شریک ہو سکتے ہیں، یہ جانور ایک خاص عمر کے اور جسمانی عیوب سے پاک ہونے چاہئیں۔ نماز عید کے بعد سے ایّامِ تشریق کے تیسرے دن کے غروبِ آفتاب تک قربانی دی جا سکتی ہے۔

قربانی سُنّتِ ابراہیمی ہے، چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے: وفدینٰہ بذبحٍ

عظیم وترکنا علیہ فی الآخرین ۰ ترجمہ :۔ "ہم نے بڑی قربانی کو اسمٰعیل کا فدیہ دیا اور ابراہیم کے بعد آنے والی اُمتوں میں اس کا ذکرِ خیر باقی رکھا"۔ قربانی دینے میں اصل چیز تقویٰ ، فرماں برداری اور خلوصِ نیت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

"خدا تک نہ تو ان کے گوشت ہی پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون ، بلکہ اس تک تمہاری پرہیزگاری (اور فرمانبرداری) پہنچتی ہے"۔ (ترجمہ)

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی کھاتے ہیں ، دوست احباب کو بھی کھلاتے ہیں اور اس کا ایک تہائی حصہ غرباء میں بانٹتے ہیں۔ اس طرح سے قربانی کی یہ تقریب نہ صرف دوستوں میں محبت بڑھانے کا ذریعہ بنتی ہے ، بلکہ غربا و مساکین کو گوشت بہم پہنچانے سے قوم کے نادار افراد کو ایک خوشی کا دن منانے میں مدد دیتی ہے۔ ایثار عمل میں آتا ہے۔ یعنی اپنی ضرورت پر کسی دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ معطی کو حصولِ فضیلت اور اصلاحِ نفس میسر آتی ہے اور خلوصِ نیت سے اللہ کے بندوں کو خوش کرنے سے اللہ کی رضا جوئی اور فرمانبرداری سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ عید اضحیٰ یوں تو اُمتِ مسلمہ کے لیے بہت بڑی خوشی کی تقریب ہے جس میں سب مسلمان خواہ وہ بیت اللہ سے قریب مصروفِ حج ہوں یا اپنے اپنے وطن میں مقیم ہوں "ذبحِ عظیم" کا قومی تہوار منانے میں مشغول ہوتے ہیں اور ملت کی اکثریت بیک وقت اپنی جبینِ نیاز کو معبودِ حقیقی کے سامنے جھکا کر روحانی ترقی کے مدارجِ اعلیٰ پر فائز ہوتی ہے۔ مگر ان مذہبی اور روحانی فوائد کے دوش بدوش بہت سے عمرانی فوائد بھی اُمت کو حاصل ہوتے ہیں ، جن کا ابھی ذکر ہوا ہے اور

جن سے یہ تقریب اُمّت کے لیے خیرِ کثیر کا موجب بن جاتی ہے، وہ ہر مسلم گھرانے کے افراد کے باہمی ارتباط اور محبّت میں اضافہ کرتی ہے۔ ساتھ ہی وہ ایک شہری سوسائٹی کے باہمی انس اور موافقت کو بھی بڑھاتی ہے اور اس سے پوری قوم کی قوم ایسے پاکیزہ جذبات سے سرشار ہو جاتی ہے، جو اس کی بہبود کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

عیدِ اضحیٰ:
(۲)
قربانی کی اہمیّت

عیدِ اضحیٰ بہت بڑا تیوہار ہے۔ اس لیے کہ اس سے ایک دن پہلے مسلمانانِ عالم کے مستطیع افراد مکۂ معظمہ سے قریب عرفات کے میدان میں جمع ہوتے ہیں اور بارگاہِ ایزدی کی طرف دل سے متوجہ ہو کر خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ذکر کرتے، روحانی مدارج کی بلندی حاصل اور فوائدِ اخروی کا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں۔ نہ صرف وہاں، بلکہ ہر شہر اور قصبے میں عید منائی جاتی ہے اور قربانی دی جاتی ہے جو زبردست اسلامی شعار ہے۔ قربان کے لفظی معنے قریب آنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ تین دفعہ آیا ہے۔ سورۂ ۴۶ (احقاف) (۲۷) میں فلولا نَصَرَھُمُ الَّذِینَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللہِ قُرْبَاناً آلِھَةً) میں تو قربان بمعنی معبود، شفعاء وغیرہ کے ہے۔ مگر باقی دو موقعوں یعنی سورۂ آلِ عمران (۱۷۹) اور المائدۃ (۳۰) میں قربان سے مراد وہ نذر و نیاز ہے، جسے آسمان سے آکر آگ چٹ کر جائے۔ یہود نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم سے خدا نے کہہ رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں حتّیٰ یأتینا بقربانٍ تأکلہ النارُ، دوسرے موقع پر ہے کہ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل، نے خدا کی جناب میں

نیازیں چڑھائیں (اِذ قرّبا قربانًا)

یہ لفظ 'قوربان' کی شکل میں عبرانی میں بھی آیا ہے۔ اور اس کے معنی ہیں چڑھاوا۔ اسی سلسلے میں اگرچہ ذِبح اور نحر اور منسک وغیرہ کے الفاظ بھی قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ مگر قربان' کے لفظ کو خاص اہمیت حاصل ہے اور عید اضحیٰ کو اسی کی وجہ سے عیدِ قربان کہا جاتا ہے، یعنی ۱۰ ذی الحجہ اور بعد کے ایامِ تشریق۔ ضحیۃ یعنی قربانی کے جانور کو قُربِ ایزدی حاصل کرنے کی غرض سے ذبح کیا جاتا ہے۔ قربانی کا یہ بنیادی تصور انسان کی اُس قدرتی خواہش پر مبنی ہے، جس سے وہ کچھ ہاتھ سے دے کر یا تلف کر کے وہ اپنے معبود کے ساتھ اپنے روحانی فائدے کے لیے رابطہ پیدا کرتا ہے۔ اس خواہش کے مظاہر اقوام و مذاہبِ عالم میں ہر زمانے میں نظر آتے ہیں۔ بابلیوں، مصریوں، یونانیوں، عبرانیوں، اہلِ ہند و ایران، بودھوں، یہودیوں، عیسائیوں، سب میں قربانی کی رسم نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔ اسلام میں قربانی نے جو اہمیت حاصل کی اس کے چند نمایاں پہلو ہیں۔ مثلاً یہ کہ عیسائیت اور بعض دیگر مذاہب کے برعکس قربانی کے خون بہانے کو اسلام میں کفّارۂ گناہ سے کوئی علاقہ نہیں۔ اسلام میں گناہوں کی معافی کا تعلق گناہگار کے توبہ و استغفار کرنے اور خدا کے غفور و رحیم کی رحمت اور بخشش سے ہے نہ کہ کسی کفّارے اور کسی خون بہانے سے، گو یہود و نصاریٰ کے ہاں کیفیت اس کے برعکس ہے۔ سِفرِ لاویان (۱۷ : ۱۱) میں ہے: "سو وہ جس سے کسی جان کا کفّارہ ہوتا ہے لہو ہی ہے" اور عبرانیوں کے خط (۹ : ۲۲) میں ہے: "اور بغیر لہو بہائے معافی نہیں ہوتی۔"

مگر اسلام کے نزدیک قربانی کا گوشت اور خون خدا کو نہیں پہنچتا۔ بلکہ قربانی پیش کرنے والے کا تقویٰ یعنی اس کی پرہیزگاری اور فرمانبرداری اور نیک نیت پہنچتی ہے۔ بنی اسرائیل اور دیگر کہنہ اقوامِ عالم کی قربانی کی بنیاد یہ تھی کہ ان کے نزدیک ان کا معبود جس کے سامنے نذر رکھی جاتی تھی۔ قربانی کے کھانے میں بن دیکھے شریک ہوتا تھا اور قربانی کا خون اور دھواں اور بُو اس کے حصّے میں آتی تھی۔ اسلام نے اس خلافِ عقل قدیم عقیدے کو مسترد کر دیا اور قربانی میں خدا کی شکر گزاری کے پہلو کو نمایاں کیا۔ چنانچہ قرآنِ مجید ۲۲ سورۂ حج آیت ۳۵ میں فرمایا ہے :-

"اور ہر ایک اُمّت کے لیے ہم نے قربانی قرار دی تھی، تاکہ خدا نے جو انھیں مویشی چارپائے دے رکھے ہیں (قربانی کرتے وقت) ان پر خدا کا نام لیں، سو (لوگو!) تم سب کا خدا وہی خدائے واحد ہے، تو اُسی کے فرمان بردار رہو۔"

پھر فرمایا :-

"... (مسلمانو!) ہم نے تمھارے لئے قربانی کے اونٹوں کو (بھی) ان شعائر اللہ (یعنی قابلِ ادب) چیزوں میں قرار دیا ہے جو خدا کے ساتھ نامزد کی جاتی ہیں۔ ان میں تمھارے چند در چند فائدے ہیں، تو ان فائدوں کے شکریے میں خدا کے نام (قربانی کرتے وقت) انھیں کھڑا رکھ کر (ذبح کرو اور ذبح کرتے وقت) ان پر خدا کا نام لو، پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں (اور ٹھنڈے ہو جائیں)

تو ان میں سے آپ بھی کھاؤ اور قناعت پیشہ اور گداگی پیشہ ہر طرح کے محتاجوں کو کھلاؤ۔ ہم نے یوں ان جانوروں کو تمھارے بس میں کر دیا ہے، تاکہ تم (ہمارا) شکر کرو۔ خدا تک نہ تو ان کے گوشت ہی پہنچتے ہیں، نہ خون ہی، بلکہ اس تک تمھاری پرہیزگاری (اور فرماں برداری) پہنچتی ہے۔ خدا نے انھیں یوں تمھارے بس میں کر دیا ہے کہ اس نے جو (احکامِ حج تعلیم کر کے) تمھیں (دین کا) سیدھا راستہ دکھا دیا ہے تو (اس کے) اس (احسان) کے بدلے میں اس کی بڑائیاں کرو اور (اے پیغمبر خلوص دل سے) نیک کام کرنے والوں کو (جنّت کی) خوشخبری سنا دو۔"

قربانی میں ایک دوسرا پہلو تذکاری اور تاریخی ہے۔ یعنی اس سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا اِحیاءِ ذکر مقصود ہے کیونکہ آپ نے اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے پر پوری آمادگی ظاہر کی تھی۔

زید بن ارقم کی حدیث "مشکٰوۃ شریف" میں دی ہے کہ صحابہ رضؓ نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ: یا رسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ اور ان کا آغاز کہاں سے ہوا؟ آپؐ نے فرمایا کہ "یہ قربانیاں تمھارے باپ ابراہیم کے سُنَن میں سے ہیں" —— قرآن مجید میں آیا ہے (ترجمہ):۔

"ہم نے انھیں (ابراہیم کو) ایک بڑے بُردبار لڑکے (اسمٰعیل کے) پیدا ہونے کی خوشخبری دی۔ پھر جب لڑکا (جوان ہوا اور) ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم نے کہا کہ بیٹا! میں

خواب (میں کیا) دیکھتا ہوں کہ (جیسے) میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں
پس تم (بھی تو اپنی جگہ) سوچو کہ تمہاری کیا رائے ہے (بیٹے نے)
کہا ابّا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامّل)، اس کی تعمیل کیجیے
انشاء اللہ آپ مجھے بھی صابر (ہی) پائیں گے۔ پھر جب دونوں
(باپ بیٹے) تعمیلِ حکم پر آمادہ ہوئے اور باپ نے (حلال کرنے
کے لیے) بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑا تو (ہمیں ان کی فرمانبرداری
نہایت ہی پسند آئی) اور ہم نے ابراہیم سے پکار کر کہا کہ ابراہیم!
تم نے (اپنے) خواب کو خوب سچ کر دکھایا۔ اب ہم تمھیں بڑے
بڑے مراتب دیں گے اور) نیک بندوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا
کرتے ہیں۔ بے شک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی اور ہم نے بڑی
قربانی کو اسمٰعیل کا فدیہ دیا۔"

حضرت ابراہیم کے اس عظیم ترین ایثار کی جو مثال ہمارے سامنے ہے اسی کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے عید قربان منائی جاتی ہے اور اس سے ہمیں یہ پائندار ناقابلِ فراموش اور گراں بہا سبق حاصل ہوتا ہے کہ افراد کو اور اقوام کو راہِ حق میں قربانیاں دینی ہوتی ہیں، جن کے لیے افراد کو اور اقوام کو محکم عزم کے ساتھ ہمیشہ آمادہ رہنا چاہیے۔

ان دو پہلوؤں یعنی شکر گزاری اور تذکاری و تاریخی کے علاوہ ایک پہلو اہدارِ نفس کا بھی ہے کہ ماسوا سے منہ موڑ کر انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ذاتِ باری کی طرف متوجہ ہو اور اپنی ہر عبادت، بلکہ اپنا جینا، مرنا، اللہ

کے لیے اور صرف اللہ کے لیے مخصوص کر دے۔

جابرؓ نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الذبح یعنی عیدِ اضحیٰ پر دو مینڈھے ذبح کیے ...... آپؐ نے جب ان کا رُخ قبلے کی طرف موڑا تو کہا:۔

اِنّی وَجّھتُ وَجھِیَ لِلّذِی فَطَرَ السمواتِ و الارض حَنِیفًا و ما انا مِن المشرکین (قرآن مجید ۶، الانعام ۷۹) ترجمہ:۔"میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رُخ اسی (ذاتِ پاک) کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں"۔

قُل اِنّ صَلاتِی و نُسُکی و مَحیایَ و مماتِیَ لِلّٰہِ ربِّ العٰلمین
لاشریک لہٗ و بذٰلک اُمِرتُ و انا اوّلُ المسلمین ۝

(قرآنِ مجید ۶ (سورۃ الانعام) : ۱۶۳)

ترجمہ:۔" کہو کہ میری نماز اور میری تمام عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا (سب) اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور مجھے ایسا ہی حکم دیا گیا ہے اور میں اس کے فرماں بردار بندوں میں پہلا (فرماں بردار) ہوں"۔

اے خدا! یہ قربانی تجھ سے ہے اور تیرے لیے ہے۔ اسے محمدؐ اور آلِ محمدؐ کی جانب سے قبول فرما اور کہا "بسم اللہ اللہ اکبر" اور انھیں ذبح کر دیا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض اور مذاہب کی طرح اسلام میں رسومِ قربانی کے لیے کسی نمائندے، نائب یا خلیفہ کے توسط کی ضرورت نہیں ہر شخص

اپنے لیے خود، بلکہ اپنے ہاتھ سے قربانی کرتا ہے۔ اس غرض کے لیے کسی متوسط کی حاجت نہیں۔ مختصر یہ کہ اسلامی قربانی جو عید اضحیٰ پر کی جاتی ہے وہ ایک قومی تہوار کی صورت تو اختیار کرتی ہے مگر آداب پرستی اور کفارے کے تخیل سے قطعاً عاری ہے۔ ذبیحہ کھانے کے لیے حلال کیا جاتا ہے۔ البتہ اس کا خون حرام ہے اور وہ ہر صورت میں حرام ہے۔ خواہ ذبیحہ عید کی تقریب پر کیا جائے یا روزانہ استعمال کے لیے۔ بنی اسرائیل کی طرح ذبیحے کے لیے نہ کشیش و کاہن کا توسط لازم ہے، نہ وہ ذبیحے میں حصے دار ہے۔ اسلام میں ہر مسلمان اپنے لیے آپ قربانی دے سکتا ہے اور قربانی کے حصے دار غربا، مستحقین و احباب و اعزہ ہیں ۔ نہ علمائے شریعت، علمائے شریعت ہونے کی حیثیت سے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام میں قربانی پرستش کے کسی آیین کا جزء نہیں اور آداب پرستی کے جزئیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ عید کی تقریب سے قربانی ہو یا عقیقے کی تقریب ہو یا منت پوری ہونے پر قربانی دی جائے یا حالت احرام میں شکار مارا ہو اور قربانی دینا آگئی ہو۔ اسلامی قربانی ایک سیدھی سادی بات ہے، جو فطری اصولوں کے عین مطابق ہے۔ سب جانتے ہیں کہ انسان کو جب کسی چیز کے حصول کی خواہش ہو تو فطری طور پر وہ چاہتا ہے کہ جو چیز اس کے پاس موجود ہے، یا جسے وہ مطلوب چیز سے کم قیمت سمجھتا ہے اسے قربان کر دے اور مطلوب چیز حاصل کرے۔ اسی طرح اگر انسان کسی ایسے فعل کا مرتکب ہو جس پر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہو تو وہ قدرتی طور پر چاہتا ہے کہ اپنے تئیں آپ سزا دے اور کوئی زحمت اپنے اوپر وارد کرے۔ اس کے برعکس اگر انسان خوش بختی سے بہرہ یاب ہو تو اس کی قدرتی

خواہش یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ، جو اس کی طرح خوش نصیب نہیں ہیں کچھ مہربانی کا سلوک کرے۔ یہی کیفیت اسلامی قربانی کی ہے، مگر ان سب صورتوں میں اسلامی قربانی رسوم پرستی اور شعیری قربانی سے، جو مثلاً بنی اسرائیل کے ہاں پائی جاتی تھی بالکل علیٰحدہ چیز ہے۔ اسلامی قربانی ایک ضیافت ہے، جس میں اصولاً غربا، کو حصّہ ملتا ہے۔ ذبیحے کا کوئی حصّہ معبود کو نہیں پہنچتا، نہ اس عمل میں کوئی رمزِ دینی یا رازِ مذہبی ہی پنہاں ہے۔ ذبیحہ اسی طرح ذبح کیا جاتا ہے، جس طرح شکار گاہ میں۔ ہر حال میں بوقتِ ذبح تکبیر پڑھی جاتی ہے اور خدا کا نام لیا جاتا ہے اس لیے کہ حکمِ شرع کے بغیر خون گرانا روا نہیں اور کسی جانور کا خون بہا کر اسے ذبح کرنا ایک شرعی فعل ہے۔

نعت گوئی

نعت گوئی، شعراء اسلام اور ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں کو ہمیشہ مرغوب رہی ہے اور ہر زبان میں ان شعراء نے اپنے جذباتِ عقیدت حضرتِ سرورِ دو عالم کے حضور میں پیش کیے ہیں، البتہ مختلف زبانوں اور مختلف زمانوں میں اندازِ بیان میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مدحیہ قصائد مطوّل اور مختصر خاصی تعداد میں اب بھی موجود ہیں۔ کعب بن زہیرؓ کا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" جو شاعر نے مدینۂ منورہ میں حضور (صلّی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر مسجدِ نبوی میں پڑھا تھا۔ ابن ہشام (م ۸۸۷) کی روایت میں ۵۸ بیت پر مشتمل ہے۔ ابنِ ہشام ہی نے بعض قصیدوں کے پورے پورے متون یا ان کے ایسے اجزاء دیے ہیں، جن میں عموماً مدحیہ ابیات کی تعداد صرف پانچ چھے تک ہے۔ امام ابن حجر نے اصابہ میں ۵۰ سے زیادہ اقتباسات حضورؐ کے معصروں کے نعتیہ کلام کے دیے ہیں۔ دیوان حسّان بن ثابتؓ میں بھی متعدد مدحیہ اشعار ہیں جو نعت ہی کی طرز میں لکھے گئے ہیں۔

ان سب اشعار میں سیدھے سادے طریق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک شخصیت کی صفت و ثنا بیان کی گئی ہے، مبالغے سے پرہیز کیا گیا ہے، حضورؐ کے جمالِ ظاہری و باطنی، آپ کی شجاعت، سخاوت اور امانت کی تعریف

کی گئی ہے اور نورِ ہدایت جو آپؐ سے خلق نے پایا اُسے سراہا گیا ہے۔ یہ جذبات حقیقی ہیں مصنوعی نہیں ہیں۔ کہیں کہیں (مثلاً ابوقیس صِرمہ کے اشعار میں) حضورؐ نے تبلیغ اسلام میں جو مساعیٔ جمیلہ صرف کیں ان کا ذکر بھی ملتا ہے (ابن ہشام ۳۵۰) اب اس طرز کی نعت نویسی کا نمونہ حضرت حسانؓ کے کلام سے سُنیے :-

اغرّ علیہ للنبوۃِ خاتمٌ مِنَ اللہِ مشھودٌ یلوح ویشھدُ

"وہ بزرگوار جسے اللہ نے مُہرِ نبوّت عطا کی کہ سب اُسے دیکھتے ہیں اور جو بڑی چمک رہی ہے۔"

وضمّ الالٰہ اسمَ النّبی الی اسمِہٖ اذا قال فی الخمسِ المؤذّنُ، اشھدُ

"جب مؤذن پانچوں نمازوں کے وقت اذان میں تشہد کہتا ہے (تو سب سنتے ہیں کہ) اللہ نے نبی کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ضم کر دیا ہے۔"

وَشَقّ لَہٗ مِنْ اِسْمِہٖ لِیُجِلّہٗ فَذُوالعرشِ محمودٌ وھذا محمّدُ

"آپؐ کے اجلال کے لیے اللہ نے آپ کے نام کا اشتقاق اپنے نام سے کیا، چنانچہ عرش کا مالک محمود ہے اور وہ محمدؐ ہیں۔"

نبیٌّ اتانا بعدَ یاسٍ وَفَترۃٍ مِنَ الرُّسُلِ وَالاَوثانُ فی الارضِ تُعبدُ

"وہ نبی جو مایوسی اور رسولوں کے ایسے (لمبے) درمیانی وقفے کے بعد ہماری طرف آئے جبکہ ملک میں بت پرستی چھا چکی تھی۔"

فَامسٰی سِراجاً مُسْتنیرًا دھادِیًا یلوحُ کما لاحَ الصقیلُ المھنّدُ

"آپ ایک روشن چراغ اور راہنما بن کر آئے جس میں ہندی فولاد کی صیقل شدہ تلوار کی طرح چمک دمک تھی۔"

وانذرنا نارا و بشر جنة   وعلمنا الاسلام فالله نحمده

"آپ نے ہمیں دوزخ سے ڈرایا اور جنّت کی خوشخبری دی۔ آپ نے ہمیں اسلام سکھایا، اس پر ہم اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔"

وانت إلٰہ الخلق ربی وخالقی   بذلك ما عمرت فی الناس اشهد

"خلقت کے معبود! تو ہی میرا رب اور خالق ہے میں جب تک دُنیا میں زندہ ہوں اسی کی گواہی دوں گا۔"

بعد کی صدیوں کے عربی نعتیہ قصائد میں شرف الدین محمد البوصیری متوفی بحدود ۶۹۴ھ/۱۲۹۶ء کا بابرکت "قصیدۂ بُردہ" ہے جس نے بے حد شہرت پائی۔ اس میں دورِ اوّل کی سی سادگی تو نہیں، مگر مبالغہ کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں۔ مثلاً یہ اقتباس سُنیے:۔

محمد سید الکونین والثقلین   والفریقین من عرب ومن عجم

(جو اوصاف مذکور ہوئے ان کا مصداق ہیں جناب) محمد سردارِ دو جہان سردارِ جنّ و انس، سردارِ عرب و عجم۔"

نبینا الآمر الناهی فلا احد   ابرّ فی قول لا منه ولا نعم

"ہمارے پیغمبر (معروف کا) حکم دینے والے (منکر سے) منع کرنے والے ہیں آپ "ہاں" کہیں یا "نہ" جو بھی آپ فرمائیں اس میں آپ سے زیادہ راستگو کوئی نہیں۔"

هو الحبیب الذی ترجی شفاعته   لکل هول من الاهوال مقتحم

"آپ وہ حبیبِ (خدا) ہیں، جن کی شفاعت کی امید ہر ناگہانی مصیبت میں کی جاسکتی ہے۔"

دَعْ ما ادَّعَتْهُ النصارٰی فی نبیّہم　　فاحکُم بما شئتَ مدحًا فیہ وَاحتکِم

"نصاریٰ نے جو دعوے اپنے پیغمبر کی نسبت کیا اُسے چھوڑ دو باقی حضورؐ کی تعریف میں جو چاہو کہو اور زور سے کہو"

وَانْسُبْ الی ذاتہ ماشئتَ مِن شَرَفٍ　　وانْسُب الیٰ قَدْرِہٖ ماشئتَ من عِظَمٖ

"آپؐ کی ذات کی طرف جس شرف اور آپؐ کے رتبہ والا کی طرف جس بزرگی کو چاہو نسبت دو"

فانّ فضلَ رسولِ اللّٰہ لیس لہ　　حدٌّ فیُعْرِبَ عنہ ناطقٌ بفَمٖ

"کیونکہ رسولِ خدا کی فضیلت کی کوئی حد و نہایت نہیں، کہ کوئی صاحبِ نطق اسے زبان سے بیان کر سکے"

فارسی زبان میں نعت گوئی کا ابتدائی دَور قدرے کمزور معلوم ہوتا ہے۔ شاہنامے کے شروع میں "در ستائشِ پیغمبرؐ" کے عنوان سے صرف چھے[۶] شعر دیے ہیں اور بس۔ دَورِ غزنویہ کے مشاہیر شعرا، مثلاً عنصری، فرخی، منوچہری، مسعودِ سعدِ سلمان اور مختاری غزنوی کے دیوان نعت سے خالی نظر آتے ہیں، البتہ سیّد حسن ملقب بہ اشرف غزنوی متوفی بحدودِ ۵۵۵ھ کے دیوان (ص ۲۳۵) میں ۵۲ شعر کا ایک ولولہ انگیز نعتیہ ترجیع بند موجود ہے۔ سیّد حسن زیارت کے لیے تربتِ حضرتِ رسولؐ پر حاضر ہوئے ہیں۔ ان کی نظم جذباتِ احترام سے لبریز ہے۔ اپنی خوش بختی پر فخر کرتے ہیں کہ زیارت نصیب ہوئی۔ علاوہ بریں چونکہ سیّد ہیں، مچل جاتے ہیں اور ناز سے اپنے سلام کے عوض میں خلعت بھی مانگتے ہیں ؎

لافِ فرزندی نیارم زد درین حضرت ولیک
خدمتے کردم، ز حضرت خلعتے بیرون فرست

آخری بند میں سادہ اور مؤثر زبان میں ارمان و آرزو کو امتیوں کے لیے شفاعت طلبی کا جامہ پہناتے ہیں ؎

یارسول اللہ حدیثِ بندگان با حق بگوی — یا ولی اللہ! گناہِ امت از یزدان بخواہ
یا نبی اللہ! برحمت حجۂ ایشان بپرس — یا صفی اللہ! بفرصت حاجتِ ایشان بخواہ
یا حبیب اللہ! تو شکر این گرانباران بگوی — یا امین اللہ! تو عذر این گنہگاران بخواہ

اشرف غزنوی کے بعد انوری (متوفی ۵۸۷ھ) اور خاقانی (متوفی ۵۹۵ھ) آتے ہیں۔ ان کے دیوانوں میں حمد تو موجود ہے مگر نعت نظر نہیں آئی۔ البتہ خاقانی کی "تحفۃ العراقین" میں متعدد نعتیں اور نعتیہ مضامین کے اشعار موجود ہیں۔ انوری اور خاقانی سے قریب ہی مولانا نظامی (متوفی بحدود ۶۰۰ھ/۱۲۰۴ء) کا زمانہ ہے۔ اُن کو اِس بارے میں شرفِ سبق حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی مثنویوں میں نعت، بلکہ کئی کئی نعتوں اور شبِ معراج کے ذکر کو ہر مثنوی کا جزو قرار دیا اور ان کے بعد بیسیوں مثنوی نگاروں حتیٰ کہ غیر مسلم شاعروں نے بھی ان کی روش اختیار کی اور ان کی تقلید میں مثنویوں میں نعت نویسی کا التزام کیا، مولانا نظامی کی نعتیں خصوصیت سے جوشِ عقیدت اور حضورؐ کی زیارت کے شوق کے جذبے سے معمور ہیں۔ مثلاً مخزن اسرار نظامی کی چار نعتوں میں سے ایک کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

اے مدنی برقعِ مکی نقاب — سایہ نشین چند بود آفتاب؟

منتظران رالبب آمد نفس — اے زتوفریاد و توفریاد رس
تک برآرای دوجہان تازہ کن — ہر دوجہان را پُر از آوازہ کن
ز آفتِ این گنبدِ آفت پذیر — دست برآور ہمہ را دستگیر
گرنظر از راہِ عنایت کنی — جملہ مہمات کفایت کنی

شیخ سعدی (متوفی ۶۹۰ھ) کے کلیات میں نعتیہ اشعار خاصی تعداد میں موجود ہیں اور ان میں سے بعض شعر تو اتنے مقبول ہوئے کہ گویا ضرب المثل بن گئے۔ علاوہ مثنوی کے انھوں نے چند نعتیہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ طیبات کے شروع میں دس شعر کی ایک نعتیہ غزل ہے۔ مگر خواتیم اور صاحبیہ کے شروع میں صرف دو دو تین تین شعر کی نعتیں گویا تبرّک کے خیال سے لکھی ہیں۔ بوستان کے شروع میں نظامی ہی کی طرز میں وہ نسبتہً طویل نعت دی ہے۔ جس کا آغاز ایک عربی شعر سے ہوتا ہے۔ یعنی —

كريمُ السجايا جميلُ الشِيَم — نبيُّ البرايا شفيعُ الأُمَم

نعت کے دو بیت جو شیخ نے گلستان کے دیباچے میں بزبانِ عربی لکھے ہیں، بے حد مقبول ہوئے ؎

بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ — کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ — صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

جیسا ابھی کہا گیا تھا۔ بعد میں آنے والے شعراء تمام مولانا نظامی کے طریق پر چلتے نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر آٹھویں صدی میں سلمان ساوجی، نویں میں قاسم الانوار اور مولانا جامی۔ دسویں میں غزالی، مشہدی اور محتشم کاشی۔ سب کے دیوانوں

میں نعتیں موجود ہیں۔ بالخصوص مولانا جامی (متوفی ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۳ء) اس رنگ میں سب سے بازی لے گئے ہیں۔ ان کی نعتیں ذاتِ والا سے شیفتگی، گرمی اشتیاق و آرزو، بیقراری و شوق، التجا و التماس، خواری و زاری کی تصویر ہیں۔ کلام میں گداز ہے اور زبان شیریں اور سہل۔ اسی لیے دل نشین ہے اور مؤثر۔ چنانچہ لباسِ ضراعت پہن کر وہ بارگاہِ محمدی میں حاضر اور یوں عرض پرداز ہوتے ہیں ؎

ز مہجوری برآمد جانِ عالم — ترحّم، یا نبی اللہ! ترحّم
نہ آخر رحمۃ للعالمینی! — ز محروماں چرا فارغ نشینی
بروں آور سر از بُردِ یمانی — کہ روے تست صبحِ زندگانی
شبِ اندوہ ما را روز گرداں — ز رویت روزِ ما فیروز گرداں
بدہ دستی ز پا افتادگاں را — بکن دلداریِ دلدادگاں را
اگرچہ غرقِ دریاے گناہیم — فتادہ خشک لب بر خاکِ راہیم
تو ابرِ رحمتی آں بہ کہ گاہی — کنی بر حالِ لب خشکاں نگاہی

حاصل یہ کہ نعت گوئی سے شعراء نے دل کا چین اور روح کا آرام ڈھونڈا اور پایا۔ نعت گوئی ایک طاعت تھی اور حصولِ ثواب کا ذریعہ۔ گو فارسی نمونے زیادہ تر مثنویوں سے پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن مثنوی کی تخصیص نہ تھی۔ قصیدہ، ترجیع بند، مسدس، مخمس، غزل، رباعی، تضمین ہر صنفِ کلام میں نعتیں موجود ہیں۔ بنیادی جذبہ جو ان مختلف صورتوں میں کارفرما ہے احترام اور محبتِ رسولؐ کا جذبہ ہے۔ یہ سلسلہ ہمارے ملک میں بھی برابر جاری رہا۔ جب تک فارسی شعرگوئی کا رواج ملک میں رہا نعتیں لکھی جاتی رہیں، جو مدحِ ذاتِ والا، سراپاے

مبارک ، قصّہِ شبِ معراج، میلاد نامے، وفات نامے، مدحِ آل واصحاب وغیرہ کے مضامین پر مشتمل تھیں۔ اب ہم اِس مقالے کو اشرف غزنوی کے ٹیپ کے بیت پر ختم کرتے ہیں ؎

سَلِّمُوا یا قوم! بل صَلُّوا علی صدرِالامینؑ
مُصطفیٰ ماجاء اِلّا رحمۃً لِّلعالمینؑ

یادِ ایّام

جس شخص کی تمام زندگی طالب علمانہ رہی ہو، یادِ ایّامِ گزشتہ اس کے لیے بیشتر اساتذہ اور ہم کاروں کی یاد کے مترادف ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ طالب علم کو ہر منزل پر استادِ شفیق کی رہنمائی یاد آتی ہے، نیز اپنے ہمکاروں کی ہمدمی۔ اب جو میں ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ جن بزرگوں نے میری زندگی کو بے حد متاثر کیا ان میں سب سے پہلا مقام میرے بزرگوار والدین کا ہے کہ انھیں سے میں نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور انھیں کے ارشاد و ہدایت سے اور ان کی نیک مثال کی تقلید سے بُرے اور بھلے کی تمیز سیکھی اور اپنی بساط کے مطابق دین داری کی بعض باتوں اور نیک عادتوں سے روشناس ہوا ؎

مرحبا اے رہنمائے راہِ دین   از تو روشن شد مرا چشمِ یقین

اس صدی کے آغاز (۱۹۰۰ء) میں، جب میں اسلامیہ کالج میں داخل ہوا تو فضا نہایت موزوں و موافق تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کالج میں اس سے بہتر دور اور اس سے خوشتر حال کی تمنا بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس وقت جن اساتذہ سے میں نے فیض پایا، ان میں شمعِ جمعِ انجمن مولانا اصغر علی روحی مرحوم کا ذکر سب سے پہلے کرنا چاہیے۔ مولانا روحی کو فارسی اور عربی زبان اور ادب میں تبحّر کے علاوہ علومِ جدیدہ سے بھی واقفیّت حاصل تھی۔ صاحبِ علم بھی تھے اور صاحبِ عمل بھی۔ دانش مند،

درویش صفت، جن کے اخلاق نیک مردوں کے تھے۔ پُرانے بزرگوں کی طرح ان کی زندگی جوارِ مسجد میں گزری، ہر طرح کی سادگی سے آراستہ اور ہر طرح کے تکلّفات سے بری۔ صحیح ادبی ذوق اور نقدِ سخن میں قوی ملکہ اُنھیں حاصل تھا۔ کالج میں اور گھر پر محاسن و معائبِ سخن کے پرکھنے پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ ان سے استفادے کا سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا، جب میں خود بھی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گیا۔ اس زمانے میں مختصر المعانی کے مطالعے کے وقت بعض مقامات پر مجھے اشکالات درپیش تھے۔ مولانا کی طرف رجوع کیا تو بوجہِ کم فرصتی انھوں نے یہ تجویز کی کہ کالج سے گھر کو واپس جاتے وقت راستے میں وہ ان اشکالات کو رفع کر دیا کریں گے۔ کالج اُن دنوں شیرانوالہ دروازے میں تھا۔ اور وہ بھاٹی دروازے میں رہتے تھے، اس راستے کو طے کرتے وقت، ان کے ہمرکاب، کتاب ہاتھ میں لے کر مشکل مقامات پڑھتا جاتا تھا اور وہ ان کو حل کرتے جاتے تھے۔ بازاروں کی گہما گہمی کسی طرح بھی اس سلسلے میں حارج نہ ہوتی تھی۔ کالج کے زمانے میں ہفتہ وار وعظ کا انتظام تھا، علومِ مشرقیہ کے اساتذہ باری باری سے وعظ کہتے تھے۔ طلبہ سب سے زیادہ مولانا کے پُرمغز وعظ کو پسند کرتے تھے۔ اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ بعض طلبہ کو ان کے مواعظِ حسنہ کے سُننے کا شوق ہی کالج کے ایک درجے کے بعد دُوسرے درجے میں کشاں کشاں دوبارہ کالج میں لاتا تھا۔ ایک زمانے میں الہدیٰ کے نام سے انھوں نے ایک ماہوار دینی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ ناقدانِ بصیر اُسے بہت پسند کرتے تھے، مگر اس قسم کے رسالوں کے مصارف کثیر ہوتے ہیں اور صرف چندے سے اُنھیں پورا کرنا بہت دُشوار۔

چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ مولانا فارسی اور عربی دونوں میں استادانہ شعر بھی کہتے تھے، گو ابھی تک ان کا کلام جمع نہیں ہوا۔ اپنے بچوں کو عربی اور فارسی کے اعلیٰ ادب کا تمام نصاب اُنھوں نے سبقاً سبقاً خود پڑھایا، اپنی کثیر مصروفیتوں اور مشاغل کے باوجود یہ کام وہ پوری توجہ سے اور ایک طویل مدت تک التزام کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔ اس بارے میں انھوں نے قابلِ تقلید مثال قائم کی۔

اسلامیہ کالج ہی میں اس زمانے میں شیخ عبدالقادر مرحوم بھی تدریس کے لیے کچھ وقت دیا کرتے تھے۔ کالج میں جب بی۔ اے کی جماعتیں کھولی گئیں تو قابل اساتذہ کا بہم پہنچانا آسان نہ تھا، شیخ صاحب نے جو اُس زمانے میں اخبار "آبزرور" کے ایڈیٹر تھے اپنے بعض اور ہمکاروں اور دوستوں سمیت کالج کے چند لیکچر اپنے ذمّے لیے۔ 'قصور میں' جو اُن کا اور میرا وطن تھا، اُن کی خدمت میں پہلی دفعہ میں حاضر ہوا تو چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اُس وقت وہ والدِ بزرگوار سے جو ان کے استاد بھی تھے ملنے کے لیے آئے تھے۔ گزشتہ صدی کے اواخر کا یہ واقعہ آج بھی ذہن میں اسی طرح محفوظ ہے جیسے کل کی بات ہو۔ کالج میں شیخ صاحب کی شفقت میرے لیے ایک قیمتی سرمائے کا حکم رکھتی تھی، اُنھوں نے نہایت ہمدرد طبیعت پائی تھی اور ان کو یہ قوی ملکہ حاصل تھا کہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر مخاطب کے حالات میں منتقل کر لیں۔ اسی لیے ان کے مشورے بہت گرانقدر ہوتے تھے، امتحانات کے لیے میرے انتخابِ مضامین اور میری طریقِ زندگی پر ان کے مشوروں کا بہت اثر پڑا۔ اردو ادب کی جو بیش بہا خدمت وہ اس زمانے

میں کر رہے تھے اس کی وجہ سے علمی حلقوں میں بے حد مقبول تھے۔ وہ خود شعر نہیں کہتے تھے۔ مگر سخن فہمی اور سخن سنجی کا ملکۂ وافر انھیں قدرت نے عطا فرمایا تھا۔ اپنی خوش بیانی اور بذلہ سنجی اور نکتہ رسی کی وجہ سے اہلِ سخن کا مجمع ہو یا مجلسِ احباب، شیخ صاحب بلبل کی طرح چہکتے اور وہ کیفیت پیدا کر دیتے تھے کہ ناقابلِ فراموش ہوتی تھی۔ پرکار کی طرح اُنھوں نے ایک قدم سے مناصبِ جلیلہ کے ایک وسیع دائرے کی سیر کی مگر دُوسرا قدم ہمیشہ علم و ادب میں مستقیم رکھا اور کسی حال میں بھی خوش خلقی اور خوش طبعی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ان کی آخری علالت میں ان کی وفات سے چند ہی روز پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اس وقت بھی افسردگی اور کدورت ان میں نہ پائی۔ وقت تنگی کر رہا تھا، مگر اُن کی معمولی بشاشت اور خوش مزاجی اس حال میں بھی باقی نظر آئی۔

کیمبرج میں جن اساتذۂ کرام کا گہرا نقش دل نے قبول کیا وہ دو تھے۔ پروفیسر اے۔ اے۔ بیون، اور پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن۔ پروفیسر بیون کم سخن، کم آمیز اور کوتاہ قلم بزرگ تھے۔ کلاسیکی دَور کی عربی میں ان کی نمایاں فضیلت مسلّم تھی۔ تجرّد میں ساری عمر گزار دی۔ ٹرنٹی کالج کے پہلے صحن کے ایک بالاخانے میں مقیم تھے، وقت کے اس قدر پابند کہ تین برس میں صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جب کلاک نے لیکچر کا گھنٹہ بجایا تو وہ کمرے کے اندر نہ تھے، مگر میں ان کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ سیڑھی سے اوپر آئے اور وہ اور میں اکٹھے کمرے میں داخل ہوئے۔ جس کمرے میں وہ لیکچر دیتے تھے اس کے پاس ہی کے کمرے میں ان کی لائبریری تھی۔ اثنائے درس میں حوالے کی کتابیں وہ اُٹھ اُٹھ کر اپنی

لائبریری سے لاتے اور مطلوبہ حوالہ کھول کر میرے سامنے رکھتے۔ میں یادداشت لکھ لیتا تو کتاب لے جاکر اس کی جگہ رکھ آتے۔ اس پیرمرد کو بعض اوقات ایک گھنٹے میں شاید دس بیس مرتبہ یہ چکّر لگانا پڑتا مگر وہ اس زحمت کی کچھ پروا نہ کرتے ان کی رائیں جچی تلی اور مستند ہوتی تھیں۔ بے سند یا مبالغہ آمیز باتوں سے انھیں کامل احتراز تھا۔ نقائض جریر والفرزدق جیسی سنگلاخ اور ضخیم کتاب کی تصحیح اُنھوں نے کمال محنت سے کی اور اپنے صَرف سے اُسے تین جلدوں میں شائع کیا۔ اس خیال سے کہ میں اس سے استفادہ کرسکوں گا پُوری کتاب کا نسخہ مجھے عنایت فرمایا۔ کیمبرج سے آنے کے بعد ان کا صرف ایک خط مجھے ملا۔ میرا ایک مضمون عجب نامے میں چھپا تھا، اس میں فرہنگ الفاظ بھی شامل تھی۔ اس میں ایک غلطی رہ گئی تھی، دیکھتے ہی خط لکھ کر مجھے اس غلطی پر متنبہ کیا۔

استاذِ مکرم پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن کے فضائل کا ذکر ابھی اگلے ہی دن کر چکا ہوں اس لیے مختصراً دو تین باتیں ان سے متعلق عرض کرتا ہوں۔ پروفیسر بیون میں اور ان میں بعض باتوں میں تضاد تھا۔ استاذ براؤن کثیرالتصنیف، خوش صحبت، اہلِ مشرق کے دوستدار اور مشرقیّت کے دلدادہ تھے، پوری ہمدردی سے طالبانِ علم کو ہر گونہ امداد دینا، ان کا دل بڑھانا، ان میں وسعتِ نظر پیدا کرنے کا اہتمام کرنا، مطالعے کا سامان اُنھیں بہم پہنچانا، ان سب باتوں کو ضروری جانتے تھے۔ ہر ٹرم میں گھر پر بلاتے، گھنٹوں اپنے کتاب خانے کی کتابیں دکھاتے اور بے شمار علمی نکات کا افادہ فرماتے۔

میری واپسی کے بعد بھی ہمیشہ شفقت آمیز مکاتیب کا سلسلہ جاری دکھا

اپنی تصنیفات اور گِب ٹرسٹ کی مطبوعات میرے کتاب خانے کے لیے پیہم ارسال فرماتے رہے۔

اب آخر میں دو ایک ہمنفسانِ ہمدم کا ذکر بھی کرنا چاہیے۔ میر حفیظ الدین میرے ہم جماعت روپڑ، ضلع انبالہ کے رہنے والے تھے۔ شعر کا صحیح مذاق رکھتے تھے۔ کالج میں کیا کیا صحبتیں ان سے رہتی تھیں! احباب کے ساتھ وہ ان دنوں میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں کس ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے! یہ وہ جلسے تھے جن میں اقبال، حالی، مولانا نذیر احمد خاں اور دیگر نام آور بزرگوں کی شمولیت کی وجہ سے وہ رونق ہوتی تھی کہ باید و شاید۔ ان کی ہمدمی اور سخن فہمی سے ہر چیز کی لذّت المضاعف ہو جاتی تھی اور ہر مجلس احباب کی رونق دو بالا۔ میر صاحب میں ایک عجیب و غریب وصف تھا۔ وہ دوسروں کی ہر تکلیف میں پوری ہمدردی کے ساتھ شریک ہو کر ان کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے، مگر خود ہر طرح کی تکلیف صبر و رضا کو کام میں لا کر خاموشی سے برداشت کرتے تھے اور اُسے احباب سے چھپاتے تھے۔ ان کے سامنے اس کا ذکر تک بھی نہیں کرتے تھے۔

مرحوم خلیفہ شجاع الدین کے ذکرِ خیر پر یہ بیان تمام کرنا چاہتا ہوں۔ مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۰۱ء میں ہوئی اس وقت سے ان کے انتقال کے وقت تک ان سے مراسم انس و مودّت اور خلوص و خُلّت نہ صرف قائم رہے، بلکہ قوی سے قوی تر ہوتے گئے۔ میرے اور ان کے بنیادی مشاغل مختلف تھے۔ اس لیے کہ وہ قانون پیشہ تھے اور میں معلّم۔ تاہم دو میدانوں میں

ہم میں اشتراکِ عمل تھا: انجمن حمایتِ اسلام میں اور یونیورسٹی میں۔ یہ ہمکاری پوری ہم آہنگی اور مفاہمت کے ساتھ ایک عمر تک قائم رہی۔ مرحوم عجیب مخلص اور دردِ دل رکھنے والا انسان تھا، احباب کے درمیان کوچک دل اور حریرِ سینہ، مگر قومی معاملات میں متصلب اور درشت، وقت کی پابندی، ذمہ داری کا کامل احساس، خوش انتظامی اور خوش تدبیری، عملی اقدامات میں احباب کو ہمراہ لیکر چلنے کی قابلیّت، قومی مقاصد کے لیے بارہا اپنے نفع و نقصان سے بے پروائی، مجالس و محافل میں شیریں سخنی اور نادرہ گفتاری۔

ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ایّامِ گزشتہ کی یاد یہ چند نام سامنے لائی ؎

نظیرِ خویش نبگذاشتند و بگذشتند
خدائے عزّ و جلّ جملہ را بیامرزاد!

خطبۂ صدارت

پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس اجلاس لاہور

شعبۂ تاریخِ اسلام

منّت پذیر ہوں کہ پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس کے شعبۂ تاریخ اسلام کی صدارت کا شرف مجھے بخشا گیا۔

اِس کانفرنس کے دُوسرے اجلاس کے لیے لاہور کا انتخاب بہت ہی موزون و مناسب ہے۔ لاہور کو پاکستان اور ہند کی اسلامی تاریخ سے بہت گہرا تعلّق ہے اور چوتھی صدی ہجری کے اواخر سے لے کر تقریباً ہر دَور کے نقوش و آثار ــــ بعض دُھندلے اور بعض روشن ــــ یہاں موجود ہیں، جو سب کے سب جاذبِ نظر اور دلچسپ ہیں، مگر ان میں سے بعض بغایت نادر، بلکہ بے مثال بھی ہیں۔

لاہور کا ذکر واضح طور پر سلاطینِ غزنہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ بقول فرشتہ ۴۲۳ھ میں غزنویوں کے مقرر کردہ گورنر نے لاہور میں رہنا شروع کیا اور گیارہ برس بعد بعہد سلطان مودود ۴۳۴ھ میں ملک ایاز کو یہاں کی حکومت سپرد ہوئی اور اس نے لاہور میں پختہ قلعہ بنوایا۔ شہر کے اندر ایک قبر موجود ہے، جس کو ملک ایاز کی قبر بتاتے ہیں، واللہ اعلم۔ فتوحاتِ غزنویہ کے ساتھ ساتھ ان حدود میں وسط ایشیا سے اسلام کے مبلّغ بھی پہنچے۔ ان میں فضل تقدّم شیخ محمد اسماعیل بخاریؒ کو حاصل ہے، جو چوتھی صدی ہجری کے آخر میں یہاں آئے اور پچاس برس سے

زائد خلقِ خدا کو اسلام کا پیغام پہنچانے میں مصروف رہے (تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۷۹)
ان کی زندگی کے آخری سالوں میں خواجہ حسین زنجانی اِس شہر میں ان کے معاصر تھے، جناب زنجانی کی قبر بھی لاہور ہی میں ہے۔ ان کی وفات کے متصل بعد بروایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء شیخ علی ہجویریؒ یہاں پہنچے (فوائد الفواد، لکھنؤ ۱۹۰۸ء ص ۳۵) اور یہیں ان کا وصال ہوا۔ چشتی کی اطلاع کے مطابق ان کی تربت پر جو گلکار سنگِ مرمر لگا ہوا ہے، وہ ابراہیم بن مسعود غزنوی کے عہد کی یادگار ہے ـــ انھیں بزرگوں اور ان کے ہمکاروں نے ان اطراف کو نورِ اسلام سے منوّر کیا۔

عہدِ غزنویہ کے لاہور کے متعلق بعض اطلاعات فخر الدین مبارک شاہ[1] نے بہم پہنچائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں ایک محلّہ عرب تھا۔ ہندو راجہ نے قلعہ لاہور وہیں بنایا تھا۔ اس قلعے میں محمود نے ایک مینار بنوایا۔ شہر میں ایک مسجد حبشی بھی تھی۔ اب ان عمارتوں کے آثار ناپید ہیں۔

مسعود ثالث غزنوی کے عہد میں یعنی ۴۹۳ھ اور ۵۰۸ھ کے درمیان لاہور غزنویوں کا دار السلطنت بنا۔ سمعانی کتاب الانساب میں (جو چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئی) لوہور[2] یا لاہور کو شہر "کثیرۃ الخیر" بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہاں سے علماء

---

[1] اختباسات از کتاب آداب الحرب والشجاعۃ (اورینٹل کالج میگزین ماہ مئی ۱۹۴۱ء) ص ۶۴ بذیل لوہور۔ [2] بفتح اللام والہاء بین الواوین ثم واو ثالثۃ فی آخرہا الراء.... ویقال لہٗ لوہور و لاہور (سمعانی) مگر ابو الفداء (تقویم البلدان) اور سیوطی (لب اللباب) نے لُوہور لکھا ہے۔

کی ایک جماعت اُٹھی۔ سمعانی نے لاہور کے دو محدثوں کے نام لیے ہیں، جو چھٹی صدی کے نصف اوّل میں فوت ہوئے۔ ان کی بہت تعریف کی ہے۔ ایک[1] کو شیخ ادیب، شاعر، کثیر المحفوظ، ملیح المحاورہ بتایا ہے اور دوسرے[2] کو فقیہ مناظر۔ اس دوسرے محدّث سے سمعانی نے خود اسفراین میں ملاقات کی اور حدیث سُنی (کتاب الانساب ورق ۴۹۷)

اسی چھٹی صدی میں (۵۸۳ھ میں) سلطان معزّالدین محمد سام غوری نے لاہور کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

مبارک شاہ مورخ مذکور غزنہ سے آکر لاہور میں بس گیا تھا۔ اس نے ۶۰۲ھ میں چند حوادث کا ذکر کیا ہے[3]۔ جو اس سال پے در پے یہاں پیش آئے۔ سلطان معزالدین لاہور آکر ٹھہرا اور کچھ دن کے بعد غزنی کو روانہ ہو گیا۔ جب دُمیَک میں پہنچا تو اسے شہید کر دیا گیا۔ یہ خبر لاہور اور دہلی پہنچی۔ دہلی سے اس خبر کو سُن کر خریف ۶۰۲ء میں ملک قطب الدین ایبک لاہور پہنچا اور شہر کے 'قصر ہمایون' میں ٹھہرا۔ لاہور ہی میں، جس کو یہ مصنف "مرکز اسلام ہند" اور "ثانی دار الملک غزنین" کہتا ہے، بالآخر قطب الدین ایبک ۶۰۷ھ میں فوت اور دفن ہوا۔

چنگیزی مغلوں کے ہاتھوں لاہور پر بار بار تباہی آئی۔ ہندوستان کی تاریخوں

---

[1] ان کا نام ابوالحسن علی بن عمر بن الحکم اللاہوری لکھا ہے، یہ لوہور میں ۵۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

[2] ان کا نام ابوالقاسم محمود بن خلف اللاہوری دیا ہے، ان کی وفات ۵۴۰ھ میں ہوئی۔

[3] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ مرورودی طبع اوررد ڈنیسون روس، لندن ۱۹۲۷ء، ۲۷ تا ۳۰، دمیک موجودہ کوٹ دھمیک ہے۔

میں جن حملوں کا ذکر ہے، ان کے علاوہ ایلخانیوں کے وزیر رشید الدین فضل اللہ نے ایک اور حملے کا ذکر بھی کیا ہے، جس میں اس کے لڑکے جلال نے قلعۂ لاہور فتح کیا۔ تیمور کے حملے کے زمانے میں بھی لاہور کو بہت نقصان پہنچا اور مدتوں تک اس میں بے رونقی رہی۔ البتہ لودھیوں کے دور میں تاتار خان نے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

لاہور کے کمال عروج کا زمانہ آل بابر کے ساتھ وابستہ ہے۔ پہلے میرزا کامران بن بابر یہاں مقیم ہوا۔ پھر اکبر نے تقریباً ۱۵ سال (۹۹۴ھ تا ۱۰۰۷ھ) یہاں قیام کیا۔ قلعۂ لاہور کی مرمت اور توسیع کی، اس میں دولت خانہ بنایا اور شہر پناہ بنائی۔ جہانگیر کے عہد میں تو اس شہر کو مغلوں کے دوسرے دارالحکومت کا مرتبہ حاصل ہوا۔ تجارت اور آبادی اور ثروت اور رونق اتنی بڑھی کہ دہلی اور آگرے کی طرح یہ سلطنتِ مغلیہ کا تیسرا نامور شہر قرار پایا۔ شاہجہان کے عہد میں معموریٔ شہر میں بیشتر اضافہ ہوا اور ہنرپیشگانِ ہر دیار اور صنعت گرانِ روزگار اس میں جمع ہوئے اور اجناسِ ہفت کشور اور اشیائے بحر و بر کی خرید و فروخت اس میں ہونے لگی۔

عہد سلطان عالمگیر کے چوتھے سال میں دریا نے عمارات اور باغات کو نقصان پہنچایا، اس لیے وہ بند بنایا گیا، جس کے کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔

مغلیہ دور کی یادگار عمارتوں[2] (مقابر، مساجد اور باغات) کے آثار شہر اور اس

---

[1] مکاتبات رشیدی (طبع لاہور) ص ۳۲۳، [2] سکینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے لاہور کے متعدد مقامات کا ذکر کیا ہے جس سے گیارھویں صدی ہجری کے نصف اول کے لاہور کے باغات، مقابر وغیرہ کی کچھ تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ (دک: ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۵۰ء ص ۲ بعد)

کے نواح میں جا بجا ملتے ہیں۔ خود قلعۂ لاہور میں اکبر سے اورنگ زیب کے عہد تک کی عمارتیں موجود ہیں، خصوصیت سے اس کی شمالی مغربی دیوار کو کاشی کار تصاویر سے ارژنگِ چین بنا دیا گیا ہے۔ شہر میں متعدد کاشی کار عمارتیں اور بھی ہیں، جو زیادہ تو عہدِ شاہجہانی سے تعلق رکھتی ہیں، مگر ان میں شیخ موسٰی آہنگر کا مقبرہ اس عہد سے پہلے کا ہے۔ ان عمارتوں پر علاوہ کاشی کاری کے کمال کے ثلث، نسخ اور نستعلیق (جلی و خفی) کی بلند پایہ خطاطی کے نمونے بھی موجود ہیں، جن میں بعض پر خطاطوں کے نام بھی درج ہیں۔ حاصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ لاہور اپنی تاریخی اہمیت کی وجہ سے اس تاریخی کانفرنس کے انعقاد کے لیے بہت موزوں پس منظر پیش کرتا ہے۔

علمِ تاریخ پر جو احسان مسلمانوں نے کیا اور اس کے ذریعے جو خدمت بنی نوعِ انسان کی سرانجام دی، اس پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ یہ ان کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے تاریخ نویسی کا ایسا تصور قائم کیا جو انھیں کے ساتھ خاص ہے۔ علاّمہ سخاوی نے تاریخ کی تعریف یہ کی ہے کہ تاریخ وہ فن ہے، جس میں وقائع زمان بلکہ وقائع عالم سے باعتبار تعیین و تخصیص و تحدیدِ وقت بحث ہوتی ہے۔ اس تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی مؤرخ تاریخ کو بیانِ وقائع تو سمجھتے ہی تھے، مگر تعیین و تحدیدِ وقت کو اس کے ساتھ لازم جانتے تھے۔

ابتدائے اسلام سے وقائع کو بقیدِ تاریخ بیان کرنے کو اتنا اہم کیوں قرار دیا گیا؟ اس کے کئی وجوہات تھے، منجملہ ان کے یہ تین تھے:-

۱۔ تنقیدِ رجالِ حدیث کے نقطۂ نظر سے یہ جاننا ضروری تھا کہ دو راویوں میں ملاقات ممکن بھی تھی یا نہیں۔ اگر دونوں کی تاریخِ وفات معلوم ہو، تو ان کے

زمانے کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ سفیانِ ثوری فرماتے ہیں:۔
جب راوی جھوٹ استعمال کرتے ہیں تو ہم ان کے لیے تاریخ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ان کے بیان کو جانچنے کے لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جس سے روایت کرنے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، وہ تاریخی اعتبار سے ممکن بھی ہے کہ نہیں۔

۲۔ بلاذریؒ نے بعض احادیث کی رو سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ۲۰ھ میں جب دیوان مدوّن کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو بنی ہاشم سے شروع کیا۔ بنو ہاشم کے بعد لوگوں کو رسول اللہ کی قرابت کے لحاظ سے ترتیب دیا۔ جو زیادہ قریب تھے، ان کو پہلے رکھا۔ جو کم قریب تھے ان کو بعد میں، وعلیٰ ہذا، جو اہلِ سوابق و مشاہد تھے۔ ان کو عطا میں ترجیح دی۔ یہ صورت تبھی ممکن تھی کہ لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی تاریخ معلوم ہو اور ان کے مختلف مشاہد میں شریک ہونے کا پتا چل سکے۔

۳۔ تاریخ پر بہت سے احکام کا مدار ہے۔ طبریؒ نے "قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ" کی تفسیر میں لکھا ہے: یعنی ان کے دین، روزے اور افطار اور مسائلِ عدت وغیرہا اور ادائے قرض اور اجیروں کی اُجرت وغیرہ کے لیے۔

مختصر یہ کہ تاریخ نویسی کا تصور جو بیان ہوا، وہ خالص اسلامی چیز ہے۔ جاہلیت میں اس قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔

لہ فتوح البلدان، طبع لائڈن ۱۸۶۶ء ص ۴۴۹ بعد ؛ قرآن مجید، ۲ : ۱۸۵۔

اسلامی دور میں جاہلیت سے صرف چند زبانی روایات پہنچی تھیں، جو بیشتر ایّام العرب اور انساب سے تعلق رکھتی تھیں اور ایک قلیل تعداد کتبات کی تھی شمالی عرب میں کم اور یمن میں زیادہ، مگر ان کتبات میں تاریخی مواد بہت کم ہے اور عرب مصنفین نے ان کو بہت کم استعمال کیا ہے۔ بنوامیہ کے عہد میں انساب پر زیادہ توجہ ہوئی۔ کتاب المعارف اور کتاب الفہرست میں نسابون اور اخباریون، یعنی مؤرخوں کا ایک ہی باب بنایا گیا ہے۔ ان میں سے بعض صرف نساب ہیں۔ بعض نسّاب اور اخباری اور بعض اخباری۔ یہ روایاتِ جاہلیت کے جمع کرنے والے زیادہ تر بصری اور کوفی ہیں۔ ان میں ابن الکلبی (متوفی ۲۰۴) کے کام کی علمی حیثیت بہت بلند ہے، کیونکہ اس فاضل نے، جس پر حضارتِ عربیہ بجا فخر کر سکتی ہے، نہ صرف جاہلیت کے بہت سے شوارد و اوابد کے متعلق زبانی روایات کو مقید کیا، بلکہ لخمیوں اور ان کے دارالحکومت حیرہ کے متعلق تحریری مصادر کو بھی استعمال کیا اور حیرہ کے گرجوں میں کلیسائی دستاویزوں کا مطالعہ کیا اور بعض پہلوی مآخذ کی اطلاعات کو ترجمہ کرا کر اپنی کتاب "الحیرۃ" میں درج کیا۔

لیکن علمِ تاریخ کو علمی حیثیت حقیقۃً سیرتِ نبوی کے مطالعے کے سلسلے میں حاصل ہوئی۔ اوّلاً اس زمانے میں کتب مبعث و مغازی مرتب ہوئیں۔ ان میں سے مغازی موسیٰ بن عقبۃ الاسدی التابعی اس فن کی قدیم ترین کتاب ہے جو ہم تک پہنچی۔ پھر اسی قسم کے مواد سے محمد بن اسحٰق المطلبی (مولاہم) المدنی التابعی (متوفی ۱۵۹ھ) نے کتاب السیرۃ و المغازی (الفہرست ص ۹۲) لکھی، جو ابن ہشام کی تہذیب و تنقیح کے بعد اس فن کی متعدد اور کتابوں میں سے معوّل علیہ بنی۔ اس کے

بعد واقدی کے شاگرد محمد ابن سعد کاتب الواقدی (متوفی ۲۳۰ھ) نے کتاب الطبقات الکبیر لکھی، اس کا ابتدائی حصہ (یعنی مطبوعہ اڈیشن کی جلد اوّل و دوم) تو سیرتِ نبوی کے ساتھ خاص ہے، مگر اس میں زیادہ تر سیرۃ الصحابہ اور تابعین کے متعلق وہ مواد دیا ہے، جس پر علم الرجال کی بنیاد رکھی گئی، وہ علمِ رجال، جس نے تاریخی مسائل میں تنقید کا عنصر داخل کیا اور تاریخ کو علم یا سائنس بنا کر اس کو انتہائی جلالتِ قدر بخشی۔

العزّ ابن جماعۃ الکنانی الحنبلی کہتے ہیں :-

اعتقادی احکام اور فقہی مسائل ہادی (برحق) کے کلام سے مأخوذ ہیں، جس نے گمراہی سے نکالا اور کوری اور جہالت کو رفع کیا، راوی ہمارے اور اس کے درمیان واسطہ ہیں۔ لہذا ان کے متعلق بحث اور ان کے احوال کے متعلق تحقیق واجب ہے اس پر سب کو اتفاق ہے۔ وہ علم جو اس امر کا کفیل ہے وہ علم تاریخ ہے۔ اس لیے بعض نے کہا ہے کہ علم تاریخ ان فرضوں میں سے ہے، جن کو فرضِ کفایہ کہتے ہیں اسی طرح السخاوی[1] (الاعلان ص ۴۴) کہتے ہیں کہ علم تاریخ فنون حدیث نبوی میں سے ایک فن ہے۔ مختصر یہ کہ علم حدیث نے تاریخ اسلام پر گہرا اثر ڈالا، اس میں طریق اسناد و تنقید رجال داخل کیا اور طبقات نویسی کے فن کو درجۂ اوّل کی اہمیت دی۔

پہلے اجمالاً ذکر آ چکا ہے کہ ابتدا میں، یعنی پہلی دو صدیوں میں تاریخ نویسی کے متعلق عراق میں بہت کام ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کا اثر تاریخ اسلام کی روایات

---

[1] الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ للسخاوی (دمشق ۱۳۴۹ھ) ص ۵۵

پر چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ بقول ابن ندیم (الفہرست ص۹۳) ابو مخنف نے عراق اور اس کی تاریخ اور اس کے فتوح کے متعلق اوروں سے زیادہ معلومات بہم پہنچائے اور مدائنی نے خراسان و ہند و فارس کے متعلق تخصّص پیدا کیا۔ مگر عراق کے علاوہ مؤرخوں کا ایک دبستان مدینۂ منوّرہ سے متعلق ہے، جنھوں نے خصوصیّت سے عہدِ راشدون کے متعلق نہایت قیمتی مواد جمع کیا، جو واقدی اور دُوسرے مؤرخوں نے اپنی کتابوں میں محفوظ کیا۔ چنانچہ ابنِ ندیم ہی کا بیان ہے کہ حجاز اور سیرت کے باب میں واقدی کی معلومات بہترین ہیں۔

دوسری صدی کے آخر میں عالمِ اسلامی کی علمی تحریکوں نے بیش از بیش قوّت پکڑی۔ منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ تھا کہ اب کاغذ عام طور پر ملنے لگا تھا۔ کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ بغداد میں ۱۷۸ھ میں بنا۔ تیسری صدی سے زبانی روایت کی بجائے تحریری یادداشتیں مرتب کرنے کا رواج عام ہوا۔ اسی زمانے میں علی بن محمّد المدائنی نے سیرت، فتوحاتِ اسلامی، خلافت اور اخبارِ قریش میں کتابیں اور رسالے لکھے، جن کی تعداد ابن ندیم کی کتاب الفہرست (ص ۱۰۱ ببعد) میں ۲۳۴ ہے۔ ان میں بعض کتابوں کے نام اس فہرست میں مکرّر آ گئے ہیں اور بعض غالباً چھوٹے چھوٹے رسالے تھے۔ پھر بھی ان کی تعداد اس مؤرخ کے نشاطِ کار، محنت اور تلاش کی دلیل ہے۔ یہ کتابیں سوا ایک آدھ کے اب ناپید ہیں۔ تاہم تنقیدِ صحیح اور صحتِ سند کی وجہ سے بلاذری اور طبری نے ان کے قیمتی مواد کو اپنی کتابوں میں ضم کر لیا اور جب وہ یکجا ہو گیا، تو لوگوں نے مدائنی کے متفرق رسالوں کے نقل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور وہ نایاب ہو گئے۔

اس زمانے، یعنی تیسری صدی سے تاریخ کا شوق مسلمانوں میں عام ہو گیا۔ اور علم تاریخ ثقافت اسلامی کا جزو بن گیا اور جہاں مسلمان پہنچے، یہ شوق ان کے ساتھ پہنچا اور جن ملکوں اور مہذب یا غیر مہذب قوموں کی مکتوب تاریخ اسلامی فتوحات سے پہلے سرے سے موجود ہی نہ تھی یا نہ ہونے کے برابر تھی، وہاں اسلام اور مسلمانوں کے پہنچنے کے بعد تاریخ نویسی شروع ہو گئی۔ مثلاً ایران کا حال ملاحظہ فرمائیں۔ اسلامی زمانے سے پہلے ایرانی قومی روایات کا مجموعہ خدای نامے میں موجود تھا، لیکن اس میں باستثنائے عہد ساسانیاں بیشتر افسانوی اشخاص کا ذکر ہے۔ اوستا کی حکایات ہیں یا قصہ سکندر و دارا کی دھندلی سی یاد ہے۔ اور خود ساسانیوں کے عہد کی کہانی میں بھی صحیح روایت پر اکثر رزم نگاری کے جوش اور شاعرانہ مبالغے نے پردہ سا ڈال دیا ہے[1]۔ لیکن اسلامی زمانے کے بعد ایران میں بے شمار تاریخیں لکھی گئیں اور اس دور کے کم و بیش ہر شاہی خاندان کی تاریخ، جس نے ایران کے کسی حصے میں بھی حکومت کی، اجمال یا تفصیل کے ساتھ وجود میں آئی۔ اسی طرح ہندوستان بھی غزنوی دور کے بعد ہی پوری طرح سے تاریخ کی روشنی میں آتا ہے۔ اس سے پہلے دور کے متعلق تاریخی مواد زیادہ تر کتبوں، سکوں وغیرہ کی شکل ہی میں ملتا ہے۔ افریقہ[2] کی بعض وحشی قوموں کو لیں، جن کے ہاں کسی قسم کا کوئی لٹریچر نہ تھا۔ نہ مواد تاریخی موجود تھا نہ مکتوب تاریخیں تھیں۔ لیکن ان کے ہاں بھی ان کے اسلامی دور سے تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اہل ملایا کے پاس بھی اُن کے

---

[1] دک بہ تکملۂ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ص ۲۳۷ الف بحوالۂ حماسۂ ملی ایران از نولڈیکہ

[2] ایضاً ص ۲۳۶ ب، ۲۴۳ ب،

اسلام لانے سے پہلے کا کوئی لٹریچر موجود نہیں اور ان کا تاریخی اور غیر تاریخی لٹریچر اسلامی زمانے سے ہی شروع ہوتا ہے (دک بہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ بذیل مادہ (Malay ، د) ۲، ۲۰۰)

ابھی ذکر ہوا تھا کہ تیسری صدی سے مسلمانوں میں تاریخ کا شوق عام ہوا۔ فی الحقیقت تیسری صدی کا زمانہ ادبِ عربی کے اعتبار سے نہایت شاندار زمانہ ہے۔ اس میں علم کی ہر شاخ پر مستند کتابیں لکھی گئیں، تاریخ میں اس سے پہلے انساب، اخبارِ فتوح اور اخبارِ عرب و انساب وطبقات اور تاریخِ بلدان پر بھی عمدہ عمدہ کتابیں لکھی گئیں۔ اس زمانے کا نامور ترین مؤرخ محمد بن جریر الطبری ہے، جس کی تاریخ میں عربوں کی قدیم محدثانہ رنگ کی تاریخ نویسی اپنے منتہائے کمال کو پہنچی۔ طبری نے پہلے اپنی تفسیر میں موادِ تفسیر کو پوری تفصیل اور نقدِ روایات کی پوری پابندی کے ساتھ یکجا جمع کیا، پھر موادِ تاریخ کو بھی اسی تفصیل اور تنقید روایت کے بعد یکجا جمع کیا، اور اس جامعیت کے ساتھ جمع کیا کہ اس کے بعد کسی کو حوصلہ ہی نہ ہوا کہ اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ کے مواد کو موردِ بحث و تمحیص بنائے اور اس کو از سرِ نو مرتب کرے۔ بعد کے آنے والوں نے یا تو تاریخ طبری کا اختصار کیا یا داستانِ تاریخ وہاں سے شروع کی جہاں طبری نے اسے چھوڑا تھا۔ مثلاً بلعمی نے فارسی میں اور ابن الاثیر نے تاریخ کامل میں۔ گو ابن الاثیر نے مغرب کے حالات اور طبری کے قریب کے زمانے کے حالات زیادہ تفصیل سے لکھے کہ یہ حصہ تاریخ طبری کا تشنہ رہ گیا تھا۔ طبری کی تاریخ نویسی کی شرط یہ تھی کہ وہ ہر واقعے کا حال کسی شاہدِ عینی یا معاصر سے نقل کرے۔ اگر ایک ہی واقعے

کی گئی روایات اُسے پہنچی ہیں تو اس نے غیر جانبداری سے انھیں علی الترتیب اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا ہے کہ مخالف و موافق مواد کو بلا تصرّف انصاف و دیانت کے ساتھ اس نے ہم تک پہنچا دیا۔ اس لحاظ سے اس کی تاریخ ماضی کی اصل دستاویزوں کا ایک قیمتی اور نادر مجموعہ ہے۔

طبری نے اپنی تاریخ میں ۳۰۲ھ تک کے وقائع بیان کیے ہیں۔ ۳۰۲ھ کی پہلی سہ ماہی کے آخر میں کتاب ختم ہوئی، اس سے تیس برس بعد یعنی ۳۳۲ھ میں مسعودی نے مروّج الذہب لکھی اور اس کے دیباچے میں اپنے زمانے تک کے اٹھاسی بڑے بڑے مؤرخوں کے نام شمار کیے۔

یہ چوتھی صدی کی بات ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸) نے تاریخ کی چالیس قسمیں شمار کی ہیں۔ اور اسّی صدی کے نصف آخر میں حافظ مُغلطای نے ایک ہی نجی کتاب خانے میں تقریباً ایک ہزار کتابیں تاریخ کی دیکھیں[۱]، غالباً یہ سب عربی میں تھیں اور ان میں سے بعض کئی کئی جلدوں میں ہوں گی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ نویسی کے میدان میں کس قدر وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ حافظ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے اسّی (۸۰) سے زیادہ صفحوں میں مختلف قسم کی عربی تاریخوں اور کتبِ سوانح کی فہرست دی ہے جن کے مضامین حسب ذیل ہیں :-

سیرت نبوی، قصص الانبیاء، تاریخ صحابہ، تاریخ خلفاء و ملوک و دول، تاریخ وزراء و فقہاء و حفاظ و محدثین و نحاۃ و ادباء، تاریخ شعراء و عُبّاد و صوفیہ و قضاۃ، تاریخ متنبّین، تاریخ اشراف و اطباء و اشاعرہ و مبتدعہ و موالی، احوال متصفین

---

۱ الاعلان ص ۹۴ ببعد، ۲ الکامل طبع مصر ۱۳۴۸ھ ۱ : ۷ ببعد،

بوصفِ مخصوص مثلاً سست بینائی والے، نابینا، یک چشم، نابینا، متصفین بہ بخل و تطفیل، تاریخ ثقات وضعفا، تاریخ بلدان،

عزالدین ابن الاثیر (متوفی ۶۰۹) نے الکامل فی التاریخ میں لکھا ہے۔ کہ تاریخ دنیا اور دین کے منافعِ کثیرہ پر شامل ہے۔ دنیاوی نفع یہ ہے کہ اخبار گزشتگان اور حوادثِ متقدمین کا حال پڑھیں تو گویا ہم اس زمانے کے لوگوں کو ان کے معاصروں کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ملوک و حکّام انجامِ اہل جور و عدوان اور ان کی بدنامی اور بلاد کی بربادی اور نقصانِ مال و جان کا حال پڑھتے ہیں، تو جور و عدوان سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور عادل حکّام کی سیرتوں کی خوبیوں سے متأثر ہو کر ان کی پیروی اختیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو مطالعۂ تاریخ سے صائب رائیں ملتی ہیں۔ حوادث اور ان کے انجام کی پہچان حاصل ہوتی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جو امر قاری کو پیش آیا وہی یا اس جیسا امر اس سے پہلے کسی اور کو بھی پیش آیا۔ اس طرح سے دوسروں کے تجارب سے ہم منتفع ہو سکتے ہیں اور اپنی مشکلات کا حل سوچ سکتے ہیں۔ اور یہ تمام امور عقل کو روشن کرتے ہیں، اس کے علاوہ تاریخی نکات و ظرائف مجالس و محافل میں جاذبِ توجہ ثابت ہوتے ہیں اور ان کی رونق کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ہے دنیا کا فائدہ۔ آخرت کا فائدہ یہ ہے کہ عاقلِ لبیب کو تقلّبِ دنیا اور اہلِ دنیا سے عبرت حاصل ہوتی ہے اور آنکھوں کے پردے اٹھتے ہیں اور حقائق واضح طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ صبر و تاسّی کی عادت پڑتی ہے (باختصار)

ابن الاثیر کے بیان کردہ فوائد سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن مقاصدِ عالیہ

کو پیش نظر رکھ کر تاریخ لکھی جاتی تھی وہ کیا تھے؟ ظاہر ہے کہ ان میں ترغیب و ترہیب، افزائش نشاط اور پیدائش آرزومندی اور پند دہی اور تسلّی و تائید اور انذار و اعتبار شامل تھے۔ مگر عامۃ الناس کے حالات پر عموماً زیادہ توجہ نہ تھی فلسفۂ تاریخ صرف اس حد تک پیش نظر تھا کہ وقائع کے متکرّر ہونے کا احساس تھا۔ اور ماضی پر مستقبل کو قیاس کرنے کا خیال موجود تھا۔

لیکن فلسفۂ تاریخ پر پوری توجہ آٹھویں صدی کے مؤرخ ابن خلدون نے دی جس نے اپنی تاریخ کے مشہورِ عالم مقدّمے میں تاریخی وقائع سے کلّیات اخذ کرنے کی کوشش کی۔ سنّت اللہ کا مشاہدہ نہ صرف احوالِ عالم میں کیا بلکہ اعمالِ انسانی میں بھی اس کو جاری پایا، جس طرح سورج، چاند ستاروں، برّ و بحر، تواترِ موسم اور توالیِ فصول میں قوانینِ فطرت کو نافذ العمل دیکھا اسی طرح ان قوانین کو انسانوں کے تطوّر اور قوموں کے عروج و زوال پر بھی مسلّط پایا، جب ایک ہی جیسے حالات پر ایک ہی جیسے نتائج مرتّب ہوں تو ایسے قواعد بنائے جا سکتے ہیں، جن سے مستقبل کی نسبت پیش گوئی کی جا سکے۔ چنانچہ ابن خلدون نے یہ قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی، اس کے تخیّل میں تاریخ صرف وقائعِ ملکی و سیاسی کے قلمبند کرنے کا ہی نام نہ تھا، بلکہ تاریخ کے دائرے میں ابن خلدون اجتماعی زندگی اور کلچر کی بہت سی چیزوں کو شامل کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے ارتقاے ادب و علم، امہات صنائع و حرف، تجارت، تکوینِ فرق و مذاہب وغیرہ وغیرہ سب کے مطالعے پر اپنے مقدمے میں پوری توجہ صرف کی۔

ابنِ خلدون کی کتاب تو اس دور میں مشرق و مغرب میں بے مثل کتاب تھی، مگر

متعدد اور مصنّف بعد کے زمانے میں پیدا ہوئے جنھوں نے خصوصاً مصر میں اپنے زمانے کی تاریخیں لکھیں، ان تاریخوں میں وہ ابن خلدون کی سی بات تو پیدا نہ کر سکے پھر بھی ان میں چند در چند خوبیاں اور متعدد خصوصیتیں تھیں، مثلاً مقریزی کو لیجیے کہ اس نے اپنی تاریخی کتابوں میں حالات نہایت محنت اور تحقیق سے جمع کیے اور دیگر مؤرخوں کی نسبت عامۃ النّاس کے اجتماعی حالات پر زیادہ روشنی ڈالی اور یہ اسی کی تجسّس اور تحقیق کا نتیجہ ہے کہ قاہرہ کے خِطَط اس تفصیل سے محفوظ ہو گئے ہیں کہ عربی کتابوں میں کسی اور شہر کا حال اتنا مفصّل درج نہیں ہوا۔

عربی کی تاریخوں کے علاوہ عہدِ اسلامی میں سینکڑوں تاریخیں فارسی زبان میں لکھی گئیں جو ایران، آلِ عثمان کی ابتدائی تاریخ اور ہندوستان سے تعلق رکھتی ہیں، صرف ہندوستان کے دورِ اسلامی کی چھوٹی بڑی کوئی پانچ سو تاریخیں فارسی میں موجود ہیں۔ فارسی تاریخ نگاری پر مفصّل گفتگو کے لیے وقت نہیں ہے مگر اس فن کے ماہرین میں ہم دو ابوالفضلوں کا ذکر ضرور کرنا چاہتے ہیں — یعنی ابوالفضل بیہقی صاحبِ "تاریخ آلِ مسعود" کا اور ابوالفضل صاحبِ "اکبر نامہ" کا۔

ان کے علاوہ رشید الدین فضل اللہ کا ذکر بھی کرنا چاہیے جس نے اپنی جامع التواریخ کو اس دَور کی ایک نادر الوضع کتاب بنا دیا اور ہر قوم مثلاً مغول و چین و روم و ہند کی تاریخ اس قوم کے علمار کی روایات کے مطابق اور اُن کے نکھوانے سے لکھی۔ ترکی زبان میں آلِ عثمان کی پانصد سالہ تاریخ نہایت مفصّل اور مسلسل اور مکمّل لکھی۔

اسلامی عہد کے اس طویل و عریض تاریخی لٹریچر کا مرتبہ دُنیا کے تاریخی ادب میں صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان شرائط کو سمجھیں، جو

تاریخ نگاری میں مسلمانوں کے پیشِ نظر تھیں، شیخ الاسلام تقی الدین سُبکی (متوفی ۷۵۶ھ) لکھتے ہیں[1] کہ تاریخ نگاری کی شرطیں متعدد ہیں :-

پہلی شرط راستی اور حق گوئی ہے، دُوسری شرط یہ ہے کہ راوی سے اگر روایت کی جائے تو اس کے لفظوں پر اعتماد ہو نہ کہ معنی پر۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ راوی سے بات مذاکرے میں سُنے اور بعد میں قلمبند کرے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ منقول عنہ کا نام لیا جائے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ اگر اپنے علم سے کسی کا حال لکھے تو صاحبِ ترجمہ کے علم، دین اور دیگر صفات کو پوری طرح سے جانتا ہو۔ چھٹی شرط یہ ہے کہ خوش تصوّر ہو، کسی کا ترجمہ لکھتے وقت اس شخص کا پُورا حال اپنے تصوّر میں لا سکے۔ ساتویں شرط یہ ہے کہ مضمون کو جچے تُلے الفاظ میں ادا کر سکے جو ادائے مطلب میں ضرورت سے کم یا زیادہ نہ ہوں۔ آٹھویں شرط یہ ہے کہ مؤرّخ عادل اور انصاف پسند ہو، جو اپنے میلانات کو مغلوب رکھے، ایسا نہ ہو کہ جن کو پسند کرتا ہو ان کی مدح کو طول دیدے اور جن کو پسند نہ کرتا ہو ان کے ترجموں کو مختصر کر دے۔

یہ تو دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سب اسلامی مؤرخوں نے ہر زمانے میں ان تمام قیود و شرائط کی پُوری پابندی کی، تاہم یہ بلند تخیّل اکثر عرب مؤرخین کے پیشِ نظر تھا اور اُنھوں نے عموماً بہت نمایاں طور پر صحیح واقعات کو تلاش کر کے قلمبند کیا اور تعصّب و ہوٰی کے مخرّب اثرات سے ان کو سالم اور محفوظ رکھا۔

اسلاف کے ان قابلِ فخر کارناموں کا ذکر ہم نے سنا، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ اسلامی کی خدمت کے سلسلے میں ہماری آج کی ضروریات کیا ہیں۔ آج

---

[1] الاعلان بالتوبیخ صہ ۲۳ ۷ ۔ بیعد،

سے آٹھ سال پہلے بھی اس سوال کے جواب دینے کی کوشش اس نیازمند نے کی تھی، وہ ضرورتیں نہ صرف یہ کہ بدستور باقی ہیں، بلکہ پہلے کی نسبت بہت زیادہ محتاجِ توجّہ ہو گئی ہیں۔

ہماری پہلی ضرورت تاریخی مخطوطات کی فراہمی ہے

اقطارِ ملک میں بیسیوں تاریخی مخطوطات مختلف گھرانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ مخطوطات اکثر فارسی میں اور کم کم عربی میں ہیں۔ ان میں سے بہت سے کس مپرسی اور عدم توجہی کی وجہ سے معرضِ تلف میں آ رہے ہیں۔ اشدّ ضروری ہے کہ جو کچھ بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے اور ان مخطوطات کو مرکزی مقامات میں محفوظ کر لیا جائے۔ اس لیے کہ ماضی کا یہ قیمتی ورثہ ایک قومی حیثیت رکھتا ہے اور انفرادی حفاظت نہیں بلکہ قومی حفاظت کا متقاضی ہے۔ ہر محبِّ علم اور دوست دارِ تاریخ کا فرض ہے کہ اس بارے میں ہر ممکن کوشش صرف کرے۔ اس لیے کہ یہ مخطوطات قصرِ تاریخ کی تعمیر کا مسالا ہیں۔ ان کے بغیر محال ہے کہ تاریخ نویسی کا کام سرانجام پا سکے۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس بارے میں کافی مستعدی کا ثبوت دیا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کے ۶۸۰۴ مخطوطات اور روٹوگراف جمع ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ۲۸۵ نسخے تاریخ اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ سکّوں، مہروں، فرامین اور کتبوں کا جمع کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ چیزیں تاریخ کا اہم اور موثّق مواد ہیں۔ سکّوں کا نہایت عمدہ ذخیرہ لاہور میوزیم میں جمع ہے۔ پرانے فرامین بھی بہت سے گھروں میں موجود ہیں۔ اگر

یہ مل سکیں تو ہماری تاریخ کے کئی روشن باب ان سے مرتب ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ملک کے گوشوں میں بیسیوں کتب بھی چھپے ہوئے ہیں جن پر تاریخ کے طالب علم کی نظر بہت کم پڑتی ہے۔ کتبے بھی انقلابِ لیل و نہار سے دیر و زود تلف ہو جاتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان کو محفوظ کر دیا جائے تاکہ حتی الامکان ان کا مواد کام میں لایا جا سکے۔

اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ یونیورسٹیوں یا تاریخی سوسائیٹیوں کی طرف سے مختلف صوبوں میں تجربہ کار، صاحبِ علم، کتاب شناس لوگوں کو مخطوط ذخائر کا پتا لگانے کے لیے بھیجا جائے تاکہ وہ کار آمد مخطوطات کا پتا لگائیں اس کے بعد ان کی فہرستیں علمی رسالوں میں شائع کی جائیں تاکہ ان لوگوں کو جو تاریخی تحقیقات میں مشغول ہوں معلوم ہو سکے کہ ان کی مطلوبات کہاں کہاں مل سکتی ہیں۔

(۲) دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ کتاب خانوں کے ذخائرِ مخطوطات کی فہرستیں مرتب کر کے شائع کی جائیں۔ پنجاب یونیورسٹی کا ذخیرۂ مخطوطات اگرچہ کافی وسیع ہے۔ مگر اس کی فقط دو فہرستیں ابھی تک شائع ہوئی ہیں، جن میں ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ نے تقریباً ۸۹۹ نسخوں کا حال علمی طریق سے بیان کیا ہے، اس سے کئی گنا زیادہ ذخیرہ ابھی اسی طرح پڑا ہے کہ اس کی تفصیلی علمی فہرست موجود نہیں۔ لہٰذا اس ذخیرے سے انتفاع پوری طرح سے نہیں ہو سکتا۔ ہماری دوسری یونیورسٹیوں کا حال غالباً اس سے بہتر نہیں۔

۳۔ اشاعتِ کتبِ تاریخیہ:۔ فراہمی مخطوطاتِ تاریخیہ سے یہ بھی مقصود ہے کہ اگر اچھے نسخے مل جائیں تو ان پر مبنی کر کے تاریخی متون کو حواشی

اور تنقیدی دیباچوں اور فہارسِ اعلام کے ساتھ شائع کیا جائے۔

ایلیٹ اور ڈوسن نے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر جو کتابیں ان کو مل سکیں ان کے ضروری حصوں کا مختصر یا مفصل انگریزی ترجمہ آٹھ جلدوں میں شائع کیا۔ یہ بجائے خود ایک عظیم الشان کام تھا مگر ترجمے سے پہلے ان کتابوں کے متون کو صحیح طور پر مرتب کرنا لازم تھا تاکہ ترجمے کی صحت پر کامل اعتماد ہو سکے مشتبہ عبارتوں سے جو ترجمہ کیا جائے گا مخدوش ہوگا۔ اب اچھے نسخوں سے کامل احتیاط کے ساتھ تصحیح کر کے ان تاریخوں کے متون شائع کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے اور اختلافاتِ نسخ اور فہارس اعلام و مواضع ان تنقیدی طباعتوں میں شامل کرنی چاہییں۔

۴۔ ۵۔ ۶۔ ایک تاریخی جرنل کا اجرار اور تحقیقاتی ادارے کا قیام اور ہند و پاکستان اور اسلامی ممالک کی جامع تاریخیں مرتب کرنا اس کانفرنس کے مسلّمہ مقاصد میں شامل ہیں۔ اس سلسلے میں عملی اقدامات کی ضرورت ہے، تاکہ یہ مقاصدِ عالیہ خدانخواستہ مدت تک زیبِ قرطاس ہی نہ رہ جائیں۔

۷۔ کتبِ نصاب کی ضرورت: اسلامی تاریخ اب سکولوں اور کالجوں میں داخلِ نصابِ تعلیم ہے لیکن مناسب و موزوں اور مستند کتابوں کی قلت ہے، ان کی تالیف و اشاعت میں اس کانفرنس کی اعانت بکار ہے۔

۸۔ عجائب خانوں کے ذخائر کی توسیع: اسلامی کلچر کے سمجھنے کے لیے بیسیوں چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جو عہدِ بعید کے فنونِ لطیفہ، اسلامی صنائع اور طرزِ معشیت کو واضح کرتی ہوں۔ ماضی بعید کی یہ چیزیں ہمارے عجائب خانوں میں بہت

کم ہیں۔ ان کو ڈھونڈنا اور محفوظ کرنا ضروری ہے۔ اسلامی عمارات کے نمونے اور خاکے بھی ان اداروں میں بہم پہنچنے چاہییں، اور ان اشیاء کے حالات مفصل بیان ہونے چاہییں۔ ہمارے آرٹ کی چیزوں کے حالات شائع کرنے میں پنجاب یونیورسٹی آرٹ ڈیپارٹمنٹ کے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے قابلِ ذکر کوشش کی ہے۔

۹۔ آثارِ قدیمہ کی حفاظت:۔ ہمارے بہت سے آثار کی طرف دورِ گزشتہ میں اس لیے توجہ نہ کی جاتی تھی کہ بجٹ محدود تھے لہذا جو آثار سطحِ زمین کے برابر آچکے تھے ان کی طرف توجہ مقدم تھی، ضرورت ہے کہ اب موجودہ آثار کی حالت کو امکانی حد تک درست کیا جائے اور "پس از آنکہ من نہ مانم" کا انتظار نہ کیا جائے۔

۱۰۔ فہارس مسکوکات:۔ لاہور میں خصوصاً (اور بعض دوسرے عجائب خانوں میں بھی) مسکوکات کا کافی بڑا ذخیرہ موجود ہے ان کی مکمل فہرستیں شائع نہیں ہوئیں، خان بہادر ظفر الحسن اور ملک شمس الدین ۔ کیوریٹر لاہور میوزیم نے یہ فہرستیں تیار کی ہیں، اب ان کو شائع ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ۱۹۱۴ء جو سابقہ فہرست کا سنۂ طباعت ہے اس وقت سے اب تک سکّوں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

آپ نے ان گزارشات کو توجہ سے سنا، اس کے لیے ہدیۂ تشکّر پیش کرتا ہوں۔

میرا کتاب خانہ

کتابیں جمع کرنے کا شوق مسلمانوں کا قدیمی ورثہ ہے۔ بہت بڑے بڑے کتاب خانے مسلمانوں نے گزشتہ صدیوں میں جمع کیے۔ چنانچہ گزشتہ صدی میں صرف استانبول میں عربی فارسی اور ترکی کی قلمی کتابیں دس لاکھ سے زیادہ جمع تھیں۔ جن میں سے آج بھی لاکھ جلدیں موجود ہیں اور دُنیا میں اور کوئی کتاب خانہ نہیں ہے جس میں ان زبانوں پر اتنی کتابیں جمع ہوں۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق اتنا عام تھا کہ چوتھی صدی میں ایک نیشاپوری شاعر کو کہنا پڑا:

علیك بالحفظ دون الجمع فی الکتب ؛ فان للکتب آفات یفرقها
الماء یغرقها والنار تحرقها ؛ والفأر یخرقها واللص یسرقها

" کتابیں جمع کرنے کے بجائے انھیں زبانی یاد کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ کتابوں پر بہت سی آفتیں آتی ہیں جن سے وہ بکھر جاتی ہیں۔
پانی انھیں ڈبو دیتا ہے۔ آگ انھیں جلا دیتی ہے۔ چوہے انھیں کتر دیتے ہیں اور چور چرا لیتے ہیں" لیکن سب کتابیں کون حفظ کر سکتا ہے؟

مجھے کتابیں جمع کرنے کا شوق اپنے اجداد سے ملا۔ میں نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گرد کتابوں کے ذخیرے پائے۔ عربی فارسی اور اردو۔ سکول کی

تعلیم ہی کے زمانے میں ان کے مطالعے کا شوق پیدا ہُوا، لبعض قلمی نسخے اس زمانے میں میرے ہاتھوں ضائع بھی ہوئے۔ ساتھیوں نے مانگے اور پھر نہ دیے۔ لیکن کتابوں کے جمع کرنے کا صحیح ذوق کیمبرج میں پیدا ہوا۔ پروفیسر براؤن اور پروفیسر بیون کے پاس نہایت قیمتی نجی کتب خانے تھے۔ پروفیسر براؤن کے پاس تو قلمی کتابوں کا ذخیرہ بھی بہت نایاب تھا۔ ہوتم شنڈلر ایران میں محکمۂ مواصلات کا ڈائرکٹر تھا۔ متقاعد ہُوا تو کیمبرج سے ستر اسّی میل پر ایک قصبے میں سکونت اختیار کی۔ وہیں فوت ہوا تو پروفیسر براؤن نے اس کا قلمی ذخیرہ تمام کا تمام خرید لیا۔ موٹر کار میں مجھے ساتھ بٹھایا اور اس کے گھر پہنچے۔ کتابوں کی فہرست بنائی اور سودا ہو گیا۔ جو شغف استاد براؤن کو کتابوں کے جمع کرنے کا تھا وہ انھوں نے چاہا کہ مجھ میں بھی پیدا ہو۔ چنانچہ گب ٹرسٹ کے مطبوعات کا پورا ذخیرہ میرے سامنے رکھا کہ جو کتابیں پسند ہوں لے لو۔ میں نے اپنی ضرورت کی کتابیں چُن لیں۔ اپنے نشریات میں سے جو کچھ ان کے پاس موجود تھا اس پر شفقت آمیز عبارتیں لکھیں اور اپنے دستخط سے اُنھیں مزیّن کر کے میرے حوالے کیا۔ ان میں گب کی کتاب تاریخ شعر ترکی کی ایک جلد بھی تھی جو استاد کی تصحیح سے شایع ہوئی تھی۔ پروفوں کو جن پر ان کے خط میں تصحیحات تھیں انھوں نے مجلّد کرا لیا تھا۔ وہ نسخہ بطریق یادگار مجھے دیا۔ یہ کتابیں میرے کیمبرج کے کتاب خانے کا بنیادی ذخیرہ تھیں۔ ان میں ہیفر اور کیمبرج کے دوسرے کتاب فروشوں کے ہاں سے کتابیں خرید خرید کر میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا تھا۔ اتفاق سے سر ٹامس آرنلڈ میرے کمرے میں آئے۔ کتابوں کو دیکھ کر مجھے وعظ پلا ڈالا

کہ مانا کہ تمھیں کتابوں کی ضرورت ہوگی، مگر تم کسی یونیورسٹی میں جاؤ گے وہاں لائبریری ضرور ہوگی۔ اپنا ذخیرہ جمع کرنا ہوسناکی ہے۔ اور طالب علم کے لیے ایسے مصارف چنداں مناسب نہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے مؤدبانہ کہا۔ جناب والا! آپ بھی تو لندن یونیورسٹی میں ہیں پھر آپ کی اپنی لائبریری کیسے جمع ہوئی؟ کہا: "اس کا اکثر اور بیشتر حصہ مختلف مصنّفوں کا ہدیہ ہے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ میری تصنیفات کا مبادلہ ہوا ہے۔ بعض رائے کے لیے اپنی کتابیں بھیجتے ہیں"۔ دل میں سوچا کہ یہ تو کمال ہے کہ ان صاحب کے پاس مصنف اتنی کتابیں بھیجتے رہتے ہیں۔ میرے پاس تو اس طرح کی ایک کتاب بھی نہیں ہوگی۔

آج پینتالیس سال کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت جو آرزو نہاں خانۂ دل میں چٹکیاں لے رہی تھی پوری ہوئی۔ اور بحمد اللہ ہر ہفتے دس دن کے بعد مختلف علماء و فضلاء اور احباب کی توجہ سے کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ اطرافِ عالم سے آہی جاتا ہے۔ ایک مدّ میرے کتاب خانے کی یہ ہے۔ پھر طالب علمی میں بہت سے نوادر انگلستان سے خریدے۔ مثلاً مطبوعات میں ابنِ عرب شاہ کی عجائب المقدور فی اخبار تیمور طبع ۱۶۳۶ء، شلِر کی طبع لغات طبع تہران، لیسٹرینج کی Palestine under the Muslims، پادہ دکورتی کی لغات نوائیہ، حیدرآباد کے کئی عربی مطبوعات، تاریخ ادب کی کتابیں جامع التواریخ طبع باکو۔ کشف المحجوب طبع سمرقند، دیوان لغۃ الترک کا ترکی ترجمہ طبع استانبول کونا دگو بلگ طبع استانبول، طبری، مسعودی۔ لائڈن کے مطبوعات جغرافی۔ فارسی اور عربی اور ترکی لغاتیں اور فرہنگیں۔ تاریخیں اور جغرافیے اور ادب

کے بہت سے دواوین اور شروح، ان کے علاوہ عربی اور فارسی کے مخطوطات جن میں سے چند ایک مصوّر و مطلاّ ہیں اور چند بخط مصنّفین و علماء ہیں۔ نوادر مخطوطات میں چند اوراق عنصری کی نایاب وامق و عذرا کے ہیں جس کا دوسرا نسخہ دنیا میں نہیں اسی ذیل میں وطواط کا عربی دیوان ہے۔ بایزید پیر روشن کی عربی کتاب مقصود المؤمنین بھی نایاب کتاب ہے۔ قصور ایک زمانے میں روشنائی تحریک کا مرکز تھا۔ ایک خویشگی قصور سے بایزید کے پاس پہنچا اور وطن واپس پہنچ کر پیر کا پیغام قصور کے افغانوں تک پہنچایا۔ اس کی فارسی اور پشتو نظم و نثر کے نمونے حال نامے میں دیے ہیں۔ مقصود المؤمنین کا قلمی نسخہ آج سے چالیس پینتالیس برس پہلے قصور کی ایک افغان خاتون نے میرے پاس فروخت کیا۔ اس وقت بایزید کی تصنیفات کے متعلق میں کچھ نہ جانتا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا او اسلام میں اس کا حال پڑھا تو معلوم ہوا کہ کتاب کس قدر نایاب ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کتاب کا ایک نسخہ آصفیہ میں بھی ہے۔ دکھنی کی ایک کمیاب کتاب شیخ داؤد ضعیفی کی ہدایاتِ ہندی ہے جو ۱۱۰۱ھ میں نظم ہوئی۔ میرا نسخہ ۱۱۹۸ھ میں کتابت ہوا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ آصفیہ میں ہے اور ایک دو نسخے سر سالار جنگ کی لائبریری میں (زور: اردو کے مخطوطات) انھیں کتابوں میں سراج اللغات کا نسخہ ہے۔ جو خان آرزو کا مصدقہ ہے قرآن مجید کا ایک نسخہ لطف اللہ المتخلص بہ مہندس بن استاد احمد لاہوری کے خط میں ہے۔

مخطوطات کے ذیل میں چند فرامین کا ذکر بھی کرنا چاہیے جو بیشتر عہد اورنگ زیب

کے ہیں چند وصلیاں ہیں جو آصف جاہ، انند رام مخلص، بیدل، صدر الدین خان وغیرہ کے خط میں ہیں۔ اور سو سے زیادہ خطّاطی کی وصلیاں ہیں جو مشہورِ عالم خطّاطوں نے کتابت کی ہیں۔

متعدّد کتابوں کے میکروفلم استانبول سے منگوائے گئے۔ مثلاً زبدۃ التواریخ حافظ ابرو (ایک جلد) مطلع سعدین کا مل نسخۂ ادرنہ۔ وغیرہ وغیرہ نیز متعدد اجزاے کتب کے عکس۔

ان چیزوں کا ذکر کہاں تک کیا جائے؟ صرفِ کثیر کے بعد یہ چیزیں حاصل ہوئیں۔ ان کی صفائی اور کرم کتابی اور دیمک سے ان کی حفاظت کافی وقت اور محنت طلب کرتی ہیں۔ لیکن ان ساری زحمتوں کے بعد جب کتاب خانے میں بیٹھ کر کسی علمی مشکل کا حل ڈھونڈا جاتا ہے یا اطّلاع کے حصول کے لیے کتابوں کی ورق گردانی کی جاتی ہے یا کسی آرٹ کے نمونے کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو جو اطمینان اور سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے اس سے سب کلفتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ یہ کتابیں فوراً انسان کو ماضی میں منتقل کر کے حال کی سعیِ لاحاصل کی کوفت کو قطعاً فراموش کر دیتی ہیں۔ عرب شاعر نے کتابوں کے متعلق خُوب کہا ہے ؎

لنا رفقاء ما نمل حدیثھم ٭ امینون مامُونون غیباً ومشھدا

فان قلت اموات فلست بکاذب ٭ وان قلت احیاء فلست مفنّدا

▪ ہمارے کچھ رفیق ہیں جن کی باتوں سے ہم اُکتاتے نہیں ہیں۔ نظر کے سامنے ہوں یا نظر سے دُور، وہ امانت دار ہیں اور مأمون۔ اگر کہیں

کہ وہ مردہ ہیں تو یہ غلط نہیں اور اگر کہیں کہ وہ زندہ ہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ خلافِ عقل بات ہے۔"

زمانۂ گزشتہ کے مصنّفوں کے فیض جاری اور دائمی سے متأثر ہو کر اور جذباتِ تشکّر کی رَو میں بہ کر بہت لوگ تھے جو ہمیشہ ان بزرگوں کا فاتحہ دلواتے تھے۔ یقیناً دل کی گہرائیوں سے ان مصنّفین کے لیے دُعا نکلتی ہے۔

بچوں کے لیے

اسلامی ممالک

(۱) عراق

پیارے بچو! تمھیں معلوم ہے کہ بلوچستان کے مغرب میں ایران ہے ایران کے مغرب میں ایک اور اسلامی ملک ہے جسے عراق کہتے ہیں۔ ہم تمھیں اس ملک کا کچھ حال سناتے ہیں۔

عراق ایک میدانی ملک ہے جو لمبائی میں زیادہ اور چوڑائی میں کم ہے۔ شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف کو پھیلا ہوا ہے۔ اس میں دو بڑے دریا بہتے ہیں۔ دجلہ اور فرات۔ ان کا رخ بھی یہی ہے۔ حقیقت میں یہ میدان انھیں دو دریاؤں کا بنایا ہوا ہے۔ جس طرح پنجاب کا میدان پنجاب کے دریاؤں نے بنایا ہے۔ دجلہ اور فرات شمالی پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ پہاڑی ڈھلانوں پر تیزی کے ساتھ بہتے ہیں تو پتھروں کو چور چور کر کے اپنے ساتھ بہا لاتے ہیں۔ پھر جب یہ دریا عراق کے ہموار سپاٹ میدان میں پہنچتے ہیں تو ان کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور پتھروں کا چورا جو پانی میں گھلا ملا ہوتا ہے وہ نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان دریاؤں کی تہ اونچی ہوتی جاتی ہے۔ وہ کناروں سے باہر نکل کر اور پہلی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ بہنے لگتے ہیں اور میدان پر نئی مٹی بچھاتے رہتے ہیں۔ اس مٹی سے زمین زرخیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پنجاب کی زرخیزی کی بھی یہی وجہ ہے۔ جس طرح پنجاب اناج کے پیدا کرنے کے لیے

دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ اسی طرح عراق بھی زرخیزی کے لیے ایسی ہی شہرت رکھتا ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ عراق کے مشرق میں ایران ہے۔ عراق کے مغرب کی طرف شام کا ملک ہے۔ جنوب میں خلیج فارس اور عرب کا ملک ہے۔ شمال میں اس کی سرحد ایک خط ہے جس پر ہموار میدان ختم ہو جاتا ہے۔ اس خط سے آگے زمین آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے۔ ان حدوں کے اندر عراق کا رقبہ تقریباً ایک لاکھ ۱۶½ ہزار مربع میل ہے۔

ملک کا زیادہ حصہ سرسبز اور زرخیز ہے۔ آج ہی نہیں ہمیشہ سے ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ زمین عموماً بہت اچھی ہے پھر یہ کہ اس کے دریاؤں سے نہریں نکال کر سارے علاقے کو سیراب کیا جاتا رہا ہے، گو یہ ضرور ہے کہ جب دریاؤں میں پانی چڑھتا ہے تو ان کے کناروں کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں کنارے ٹوٹ نہ جائیں اور پانی آس پاس کے علاقے میں دلدلیں نہ بنا دے۔ حقیقت یہی ہے کہ عراق کی خوش حالی کا مدار دجلے اور فرات پر ہے، طرح طرح کا اناج یہاں خوب پیدا ہوتا ہے کھجور کا درخت عام ہے اور یہاں خُوب پھُولتا پھلتا ہے۔ بیسیوں ہی قسم کی کھجوریں ہوتی ہیں، ساری دُنیا میں اتنی کھجوریں اور کہیں پیدا نہیں ہوتیں، جتنی عراق میں۔ اس ملک کے تقریباً دسویں حصے میں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ گھاس عام ہے، اس لیے مویشی پالنے کے کام میں بھی لوگ دلچسپی لیتے ہیں، آبادی ساڑھے ۶۵ لاکھ سے کچھ کم ہے (۱۹۵۷ء) مگر بڑے شہر زیادہ نہیں۔ اکثر آبادی دیہاتی ہے۔ سب سے بڑا شہر بغداد ہے۔ (آبادی [redacted] لاکھ کے قریب) یہی

عراق کا مرکز ہے۔ آبادی میں یہ شہر لاہور سے بہت کم ہے۔ بغداد سے دوسرے درجے پر موصل ہے یہاں مٹی کے تیل کے چشمے ہیں، ملک کی آمدنی کا بڑا حصہ تیل سے حاصل ہوتا ہے۔ خلیج فارس کے کنارے پر بصرے کی بندرگاہ ہے جس کی آبادی چار لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ کربلائے معلّٰی اور نجف اشرف بھی عراق ہی کے شہر ہیں۔

اسلامی تاریخ میں شروع ہی سے عراق بہت اہم علاقہ رہا ہے۔ اسلامی زمانے کی ابتدا میں یہاں ایران کی بادشاہت تھی، مگر مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے ہی میں اسے فتح کر لیا اور کوفے اور بصرے کی چھاؤنیاں آباد کیں۔ یہ شہر آج بھی موجود ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے بغداد کا شہر آباد کیا، جو خلافت کا مرکز بن گیا۔ اس کی رونق اور چہل پہل صدیوں تک قائم رہی، لیکن تقریباً پانچ سو سال کے بعد پرانے بغداد کو تاتاریوں نے برباد کر دیا، کچھ عرصے کے بعد موجودہ بغداد پھر سے آباد ہوا۔ ڈھائی سو سال کے بعد اس ملک کو پہلے ایرانیوں نے، اور پھر ترکوں نے فتح کیا۔ ۱۹۱۸ء تک یہاں ترکوں کا قبضہ رہا۔ ۱۹۲۱ء سے موجودہ خاندان کی حکومت ہے۔ اس زمانے میں عراق ترقی کی راہ پر چلنے کی بہت کوشش کر رہا ہے۔ ملیریا، جو شمالی عراق میں بہت ہوتا ہے اس کے روکنے کا بڑا انتظام ہوا ہے۔ دریاؤں کو گہرا کیا جا رہا ہے، تاکہ پانی کا چڑھاؤ زیادہ نقصان نہ کرے۔ امدادِ باہمی کو ترقی دی جا رہی ہے اور اسی طرح کے بہت سے ترقی کے کام ہو رہے ہیں۔

یوں تو ہمارے ملک اور عراق کے تعلقات قدیم زمانے سے ہیں، مگر حال کے زمانے میں عراق اور پاکستان کے درمیان ان تعلقات کو پھر سے مضبوط کیا گیا ہے اور ان دو اسلامی ملکوں میں دوستی اور محبّت روز بروز بڑھ رہی ہے اور اسی میں دونوں ملکوں کا فائدہ ہے۔

آؤ بچو! کہانی سنو!

پیارے بچو! ہمارے اردگرد جو چیزیں ہیں انھیں ہمیں غور سے دیکھنا چاہیے۔ خدا نے ہمیں آنکھیں اس لیے دی ہیں کہ دیکھیں۔ دیکھنے سے مطلب یہ ہے کہ چیزیں آنکھیں کھول کر دیکھیں، ہوش سے دیکھیں۔ یاد رکھو کہ دیکھنے دیکھنے میں بہت فرق ہے۔ دو آدمی ایک ہی چیز دیکھتے ہیں۔ ایک دیکھ کر چیز کا پورا حال معلوم کر لیتا ہے، دوسرا بالکل سرسری نظر سے دیکھتا ہے اور اس کا دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہو جاتا ہے۔ غرض چیزوں کو بچپن ہی سے غور سے دیکھنا چاہیے تاکہ اس کی عادت پڑے۔ اب تمھیں ایک کہانی سناتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ غور سے چیزیں دیکھنے کی عادت کتنی مفید ہے۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ عرب کے ملک میں تین بھائی سفر کر رہے تھے، راستے میں انھیں ایک آدمی ملا، جس کا اونٹ گم ہو گیا تھا۔ اور وہ اُسے ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ مسافروں کو دیکھ کر اونٹ والے کو خیال ہوا کہ شاید انھوں

نے اسے کہیں دیکھا ہو۔ چنانچہ مسافروں سے پوچھا: آپ نے میرا کوئی اونٹ تو نہیں دیکھا۔ بڑے بھائی نے کہا: تمھارا اونٹ کانا تو نہیں؟ مالک نے کہا: بے شک کانا ہے۔ منجھلے بھائی نے کہا: تمھارے اونٹ کا ایک دانت ٹوٹا ہُوا ہے نا؟ مالک نے کہا: آپ ٹھیک کہتے ہیں، اس کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اس پر چھوٹے بھائی نے پوچھا: تمھارا اونٹ ایک پاؤں سے لنگڑا بھی ہے؟ اونٹ والے نے کہا: درست ہے وہ ایک پاؤں سے لنگڑا بھی ہے اس پر بڑے بھائی نے کہا، جس راستے سے ہم آئے ہیں اسی پر چلتے جاؤ، تمھارا اونٹ تمھیں مل جائے گا۔ اونٹ والا بھاگ کر اس راستے پر گیا مگر دو میل تک اسے اونٹ نہ ملا اور مایوس ہو کر اُلٹے پاؤں چلا آیا اور مسافروں کو بتایا کہ اونٹ کہیں نہیں ملا۔ آپ نے اس کا حال ٹھیک بتایا تھا۔ آپ نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ بڑے بھائی نے کہا: تمھارے اونٹ پر ایک طرف اناج اور دوسری طرف شہد لدا ہوا تھا؟ مالک نے کہا: بالکل ٹھیک، اب آپ مہربانی کریں اور اونٹ مجھے دلائیں۔ تینوں بھائیوں نے کہا۔ یقین جاننا تمھارا اونٹ ہم نے نہ کہیں خود دیکھا نہ کسی سے اس کا حال سُنا۔ مالک چلایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ نے سب پتے ٹھیک دیے ہیں۔ اگر اس کا حال دیکھا سنا نہیں تو یہ پتے آپ نے کس طرح سے دیے؟

تینوں بھائیوں نے مالک کو دوبارہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ انھوں نے اونٹ کو نہ خود دیکھا نہ اس کا حال کسی سے سنا۔ مالک کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلا اور جب چاروں شہر میں پہنچے تو مالک نے حاکم کے

پاس شکایت کر کے اُنھیں پکڑوا دیا۔ اتفاق سے کچھ دن بعد کسی نے اونٹ کا پتا مالک کو دیا اور اونٹ مل گیا۔ مالک نے حاکم کو خبر دی تو اس نے حیران ہو کر تینوں بھائیوں سے پوچھا کہ تم لوگوں نے دیکھے بغیر اونٹ کا سارا حال کیونکر معلوم کر لیا؟ بڑے بھائی نے کہا کہ ہم جس راستے سے آ رہے تھے۔ اس کے دونوں طرف گھاس تھی۔ مگر صرف ایک ہی طرف سے چری ہوئی تھی۔ میں نے سمجھ لیا کہ اونٹ کی ایک ہی آنکھ تھی۔ اگر دونوں آنکھیں ہوتیں تو دوسری طرف کی گھاس بھی ضرور چرتا۔ مگر اس نے دوسری طرف کی گھاس کو دیکھا بھی نہیں۔ منجھلے بھائی نے کہا کہ چری ہوئی گھاس یکساں نہ ہونے ہی سے روشن تھا کہ اونٹ کا ایک دانت یقیناً غائب ہے۔ تیسرے نے کہا کہ میں نے اونٹ کا لنگڑا ہونا اس طرح جانا کہ لنگڑی ٹانگ والے پاؤں کا نشان دوسرے پاؤں کے نشان سے الگ تھا۔ بڑے بھائی نے دوبارہ کہا' یہ جو میں نے کہا کہ اونٹ پر ایک طرف اناج لدا ہوا تھا اور دوسری طرف شہد۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راستے میں ایک طرف اناج کے گرنے سے کیڑوں مکوڑوں کی قطار بنی ہوئی تھی اور دوسری طرف شہد کے گرنے سے مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس پر اس حاکم نے ان تینوں آدمیوں کی بہت تعریف کی کہ انھوں نے چیزوں کو غور سے دیکھا اور جو کچھ دیکھا اسے عقل سے سمجھا۔

بہت سے لوگ جنھیں غور سے دیکھنے کی عادت نہ ہو اسی راستے سے گزرتے جس سے یہ تین بھائی گزر رہے تھے، تو یا کچھ بھی نہ دیکھتے اور دیکھتے تو اس کا مطلب بہت کم سمجھتے۔ نتیجہ اس کہانی سے یہ نکلا کہ آنکھوں کو درست

طریقے سے کام میں لانا اور چیزوں پر غور کرنا بہت ضروری اور فائدہ مند عادت ہے۔

حضرت امام حسینؓ کا بچپن

پیارے بچو! تمھیں معلوم ہے کہ یہ مہینہ محرم الحرام کا ہے۔ اِس تقریب سے آج ہم تمھیں شہیدوں کے سردار حضرت امام حسینؓ کے بچپن کے حالات سنانا چاہتے ہیں۔

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ان کے والد بزرگوار حضرت علیؓ اور ان کی والدۂ مکرّمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ تھیں۔ جناب امام کی پیدائش ہجرت کے چوتھے سال شعبان کے مہینے میں ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؓ ان سے عمر میں تقریباً ایک سال بڑے تھے۔ جناب امام حسینؓ جب پیدا ہوئے تو باپ نے ان کا نام حرب تجویز کیا تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بجائے آپ کا نام حسین رکھا (اغانی)۔ قیس بن ذریح مشہور عربی شاعر کی ماں نے جو مدینے ہی میں رہتی تھی، آپ کو دودھ پلایا (اغانی)۔ جناب حسینؓ اور ان کے بڑے بھائی حسنؓ دونوں کا بچپن اکھٹا گزرا۔ دونوں بھائی ماں باپ کے تو پیارے تھے ہی۔ رسول اللہؐ کو بھی ان سے بے حد محبت تھی۔ آپ فرماتے تھے کہ "یہ میرے دو ریحانہ

(نازبُو کے گلدستے) ہیں" (کنزالعمّال و ابنِ حجر) یعنی میرے فرزند ہیں اور میرے لیے رزق اور رحمت اور راحت کا حکم رکھتے ہیں۔ (نہایہ) نیز آپ نے ان کے لیے دُعا فرمائی اور کہا کہ: "الٰہی! میں ان دونوں سے محبّت کرتا ہوں تُو بھی ان سے محبّت کیجیو"۔ (کنزالعمّال) یہ بھی فرمایا کہ: "حسین کو میری جرأت اور میری سخاوت ملی ہے" (اغانی) حدیث میں ہے کہ دونوں بھائی رسولؐ اللہ کی موجودگی میں کشتی لڑا کرتے تھے (ابنِ حجر) یہ بھی: کہ آنحضرتؐ سجدے میں تھے۔ نواسے آئے تو آپ کی پیٹھ پر بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ بھی پاس ہی تھے۔ کہنے لگے: "تمھاری سواری کیا ہی اچھی سواری ہے!" اس پر حضورؐ نے فرمایا: "اور یہ دو سوار بھی کیا ہی اچھے سوار ہیں!" (اغانی) ایک دفعہ حضورؐ کچھ فرما رہے تھے۔ دیکھا تو دونوں بچے آ رہے تھے۔ بچے تو تھے ہی چلنے میں لڑکھڑانے لگے۔ حضورؐ نے فوراً لپک کر انھیں گود میں اُٹھا لیا اور فرمایا: "خدا نے سچ فرمایا کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تو بڑی آزمائش ہیں۔ میں نے ان دونوں بچوں کو دیکھا کہ چلنے میں لڑکھڑا رہے ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ بات کو بیچ ہی میں چھوڑا اور انھیں اٹھا لیا"۔ (کنزالعمّال)

آنحضرتؐ نے ۱۱ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ اس وقت جناب حسینؓ کی عمر تقریباً سات سال کی تھی۔ آپؐ نے ان بچوں کی نسبت حضرت علیؓ کو اچھی اچھی باتوں کی وصیّت کی (نہایہ) اور یہ بھی فرمایا: "بارِ خدایا! میں ان دونوں کو تیرے اور صالح مومنوں کے سپرد کرتا ہوں"۔ (کنزالعمّال) آنحضورؐ

کے انتقال کے چھے مہینے بعد ہی رمضان ۱۱ھ میں ان بچوں نے والدہ کی وفات کا صدمہ بھی دیکھا۔ حضرت خاتونِ جنّتؓ نے بسترِ مرگ پر اپنے شوہر کو وصیت کی کہ دونوں بیٹوں اور ان کی بہنوں کو بہت عزیز رکھیں اور شفقت و رحمت کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑیں۔

جنابِ حسینؓ کو بچپن ہی میں حضرت سرورِ کائناتؐ سے تربیت پانے کا شرف حاصل ہوا۔ روایت ہے کہ جنابِ سرورِ کائناتؐ نے جنابِ حسنؓ اور حسینؓ اور ان کے چچیرے بھائی عبداللہ بن جعفر کو بچپن ہی میں بیعت فرمایا۔ یہ شرف انھیں بچوں کو حاصل ہوا۔ ان کے سوا حضورؐ نے اور کسی بچے کو بیعت نہ فرمایا (العقد) اس نورِ ہدایت کے سوا جو حضرت حسینؓ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے والدِ ماجد سے پہنچا، آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ معلّم سے رسمی تعلیم بھی پائی۔ اشراف میں سے ایک شخص عبداللہ بن حبیب تھے جنھوں نے دونوں بھائیوں کو تعلیم دی (المحبّر) اس کا پورا حال تو معلوم نہیں لیکن قیاس سے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید ضرور پڑھا ہوگا اور لکھنا بھی سیکھا ہوگا۔ اور غالباً اُس زمانے کے رواج کے مطابق شعر کی روایت بھی سیکھ لی ہوگی۔ اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جب ان کی عمر بیس برس یا کچھ زیادہ تھی تو انھوں نے مشہور شاعر نابغۃ الجعدی سے شعر سُنانے کی فرمائش کی تھی۔ ایک شعر سن کر کہا: ہمیں تو یہ روایت پہنچی ہے کہ یہ شعر فلاں شاعر کا ہے۔ اس پر نابغہ نے یقین دلایا کہ یہ شعر میرا ہے اور سب سے پہلے میں نے ہی اسے کہا ہے (اغانی) علاوہ نوشت و خواند اور روایتِ شعر کے آپ نے

دستور کے مطابق سواری اور اسلحہ کا استعمال بھی سیکھا ہوگا، کیونکہ آپ اپنے والدِ بزرگوار کے عہد کی جنگوں میں شریک ہوئے تھے اور اس سے پہلے بھی جب حضرت عثمانؓ کو باغیوں نے ان کے مکان میں گھیر لیا تو حضرت علیؓ نے جناب حسنؓ و حسینؓ کو حکم دیا تھا کہ تلوار لے کر حضرت عثمانؓ کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں اور کسی کو موقع نہ دیں کہ انھیں ضرر پہنچائے (العقد)

اب ہم حضرت حسینؓ کے بچپن کے ایک واقعے پر یہ بیان ختم کرتے ہیں۔ یہ حضرت عمرؓ کے زمانے کی بات ہے۔ یہ یاد رہے کہ جب حضرت عمرؓ کی خلافت شروع ہوئی تو جناب حسینؓ کی عمر تقریباً نو برس کی تھی۔ خود حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ: میں (حضرت) عمرؓ کے پاس آیا وہ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ میں منبر پر چڑھا اور ان سے کہا: میرے باپ کے منبر سے اُتریے اور اپنے باپ کے منبر کی طرف جائیے۔ (حضرت) عمرؓ نے کہا، میرے باپ کے پاس منبر نہ تھا۔ پھر مجھے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، اور میں کنکریوں کو ہاتھ میں الٹتا پلٹتا رہا۔ جب وہ منبر سے اُترے تو مجھے اپنے گھر لے گئے اور پوچھا، آپ کو کس نے سکھایا تھا؟ میں نے کہا واللہ مجھے کسی نے نہیں سکھایا۔ پھر کہا: میرا باپ آپ پر قربان، کاش آپ ہمارے پاس آیا کریں۔

میں ایک دفعہ گیا تو وہ (حضرت) معاویہؓ سے تنہائی میں باتیں کر رہے تھے اور ابنِ عمرؓ دروازے پر تھے۔ وہ واپس ہوئے اور ان کے ساتھ میں بھی چلا آیا۔ بعد میں (حضرت) عمرؓ ملے تو کہا، آپ آئے نہیں؟ میں

نے کہا، امیر المؤمنین! میں آیا تھا آپ معاویہؓ سے تنہائی میں باتیں کر رہے تھے اور میں ابنِ عمرؓ کے ساتھ واپس آ گیا۔ آپ نے فرمایا، آپ کا حق ابنِ عمر سے زیادہ ہے۔ ہماری سرسبزی جو نظر آ رہی ہے اللہ کی دین ہے اور پھر آپ لوگوں کی۔ (ابن حجر)

امام شافعیؒ

آج ہم آپ کو امام شافعیؒ کے بچپن کا کچھ حال سنانا چاہتے ہیں۔ "امام" دین کے پیشوا اور ہدایت دینے والے کو کہتے ہیں، امام شافعی بھی ایسے ہی بزرگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ اس لیے انھیں بھی امام کہتے ہیں۔ ان کا نام محمد تھا، ان کے والد ماجد کا ادریس اور ان کے پردادا کا شافع تھا۔ جن کی وجہ سے انھیں شافعی کہتے ہیں۔ آپ قریشی اور ہاشمی تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد ہاشم کی اولاد میں سے تھے۔ یہ ۱۵۰ھ میں غزّہ میں پیدا ہوئے۔ غزّہ آج بھی ہے اور سمندر کے قریب اس سڑک پر واقع ہے جو مصر سے شام کو جاتی ہے۔ شافعی بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ دو برس کی عمر میں والدہ انھیں مکہ شریف لے آئیں۔ غریبی کی حالت میں بڑی مشکل سے پالا اور پڑھوایا۔ مکہ شریف کے دستور کے مطابق بچپن میں ان کو شہر سے باہر بدوؤں کے پاس بھیج دیا۔ اس لیے

کہ ایک تو مکّے میں گرمی بہت ہوتی ہے، دوسرے بدویوں کی عربی بول چال بہت صحیح ہونے کے باعث بچے ان میں رہ کر بہت صحیح زبان بولنے لگتے ہیں۔ تیسرے ان کی زندگی بہت سادہ ہوتی ہے۔ غرض انھوں نے بدویوں کی سادگی اور صحیح زبان سیکھی اور بدویوں میں رہنے کی وجہ سے انھیں پرانے عرب شاعروں کا کلام بھی یاد ہو گیا اور وہ اس کو ایسی اچھی طرح سے سمجھنے لگے کہ بڑے بڑے ماہر ان سے پرانے شاعروں کا کلام پڑھنے اور سمجھنے کے لیے آنے لگے۔ حالانکہ یہ عمر میں ان سے بہت چھوٹے تھے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ سات سال کی عمر میں انھوں نے قرآن شریف یاد کر لیا۔ پھر اپنے زمانے کے رواج کے مطابق انھوں نے مکّے کے مشہور عالموں سے حدیث شریف اور فقہ کا علم پڑھا۔ حدیث شریف کی پہلی بڑی کتاب کا نام موطّا ہے اور یہ اسی زمانے میں مدینۂ شریف میں امام مالک بن انسؓ نے جمع کی تھی۔ شافعیؒ نے اس کتاب کو لڑکپن ہی میں حفظ کر لیا پھر ان کے دل میں شوق پیدا ہوا کہ مدینۂ شریف جا کر امام مالکؒ سے موطّا پڑھیں۔ انھوں نے مکّے کے حاکم سے مدینے کے حاکم کے نام سفارشی چٹھی لکھوائی اور مدینے پہنچے۔ جب یہ چٹھی امام مالک کو دی گئی تو انھوں نے کہا۔ "افسوس ہے کہ رسول اللہ کا علم، اب وسیلوں کے ذریعے طلب کیا جانے لگا۔" نوجوان شافعی نے آگے بڑھ کر اپنا حال عرض کیا۔ امام مالک ان کی باتوں سے اتنے متأثر ہوئے کہ ان کا نام پوچھا۔ نام سن کر کہا: "اے محمدؐ! خدا سے ڈرو اور گناہوں سے بچو۔ عنقریب تمھاری شان بلند ہو گی۔ اللہ نے تمھارے دل میں

نُور روشن کیا ہے۔ اس نُور کو گناہوں سے بجھا نہ دینا' کل کسی کو ساتھ لاؤ جو موطّا پڑھے اور تم سنو"۔ انھوں نے عرض کیا کہ "کتاب تو مجھے حفظ یاد ہے کسی کو پڑھنے کے لیے لانے کی ضرورت نہیں ہوگی"۔ دُوسرے دن جب انھوں نے پڑھنا شروع کیا تو ایسی اچھی طرح سے پڑھا کہ امام عش عش کر اُٹھے۔ تھوڑے دنوں میں اُنھوں نے کتاب ختم کر لی اور جب تک امام زندہ رہے (یعنی ۱۷۹ھ تک) یہ مدینے ہی میں رہے اور ان سے فیض پاتے رہے۔ ۱۵ برس کی عمر میں انھیں فتویٰ دینے کی اجازت ملی۔ چونکہ غریبی سے مجبور تھے۔ کسی نے حاکم مدینہ کے پاس سفارش کی اور اس نے بہت سے کام ان کے سپرد کر دیے جو انھوں نے اتنی محنت اور خوبی سے پورے کیے کہ سب نے تعریف کی۔ پھر یہ بغداد گئے اور کئی سال تک وہاں کے عالموں کو پڑھاتے رہے۔ پھر مصر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور قاہرہ ہی میں ۲۰۴ھ میں انتقال فرمایا۔ امام شافعی امانتدار انصاف والے' خدا سے ڈرنے والے' پاک' نیک عادتوں والے' اونچے مرتبے والے اور سخی تھے۔ انھوں نے ۱۱۴ کتابیں لکھیں جن میں سے ایک رسالہ بہت مشہور ہے جس میں انھوں نے علم فقہ کے اصول بتائے ہیں۔ ان سے پہلے فقہ کے اصولوں پر کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔ اپنی کتابوں میں وہ بات چیت کا طریقہ برتتے تھے گویا دو آدمی بحث کر رہے ہیں' اس طرح مضمون کو بہت دلچسپ بنا دیتے تھے۔ مصر' جنوبی عرب اور ملایا میں اب تک بہت سے لوگ ان کے پیرو ہیں۔ انھیں بھی شافعی کہتے ہیں۔ امام شافعی شعر بھی بہت اچھے کہتے تھے۔ فرماتے ہیں: "مالدار آدمی اگر مال کے ذریعے سے تعریف نہ کمائے اور اجر نہ پائے تو وہ محروم آدمی ہے۔ جو بات دُور نظر آتی ہے' وہ محنت کرنے سے قریب ہو جاتی ہے۔ محنت سے ہر بند دروازہ کھُل جاتا ہے"۔

میرے اُستاد

پیارے بچو! آج اپنے اُستادوں کے بارے میں تم سے باتیں کریں گے۔

لاہور سے کوئی ۳۴ میل پر قصور پرانا تاریخی قصبہ ہے جو میرا وطن ہے۔ سکول کی تعلیم میں نے وہیں پائی۔ عربی اور اردو کا قاعدہ تو ماں باپ سے پڑھا۔ نماز انھیں سے سیکھی۔ چند سورتیں انھیں نے یاد کرائیں۔ ابھی تک یاد ہے کہ شب کو سونے سے پہلے اِن سورتوں کا سُنانا لازم تھا اور بچپن کی نیند تھی کہ حواس پر غالب تھی۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ سُنانے سے پہلے سونے کی اجازت مِل جائے۔ قصور میں موجودہ ہائی سکول کی شاندار عمارت اُس وقت بنی جب میری عمر تین برس کی تھی۔ اس سکول سے میں نے انٹرنیس پاس کیا۔ سکول کے اُستادوں میں سے پرائمری کے اُستاد مجھے سب کے سب اچھی طرح سے یاد ہیں۔ اُس زمانے میں نارمل پاس مدرّس بہت کم تھے اِس لیے اُن کا طریقۂ تعلیم پرانا ہی تھا۔ جماعت کی جماعت کو کھڑا کر کے مبتدیوں سے پہاڑوں کی مُہارنی لی جاتی تھی۔ تیسری جماعت میں رسومِ ہند کی مشکل عبارتیں املاء

کے طور پر لکھائی جاتی تھیں۔ حافظے پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ جغرافیہ اس طرح پڑھایا جاتا تھا کہ نقشے کے سامنے طلبہ کو کھڑا کر کے پہاڑوں سمندروں، دریاؤں، صوبوں، شہروں وغیرہ کے نام اور ان کا محلِ وقوع رٹایا جاتا تھا۔ یہ طریقہ انٹرینس کی جماعتوں میں بھی جاری رہا اور انگلستان کے اضلاع اور شہروں کے نام حفظ کرنے میں جو کوفت ہوتی تھی وہ اب بھی یاد ہے۔ چوتھی جماعت سے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی کی تعلیم بھی شروع ہوئی۔ الفاظ کے معنے بتائے اور یاد کرائے جاتے تھے۔ ہجوں کے یاد کرانے کے لیے ڈکٹیشن املا پر بھی زور تھا۔ مڈل کی جماعتوں میں عربی کی تعلیم کا اضافہ ہوا۔ انٹرینس میں انگریزی کی معمولی ریڈریں پڑھائی جاتی تھیں جو اس ملک کے طلبہ کے لیے خاص طور پر موزوں نہ تھیں۔ سائنس کی مورل ریڈر بھی داخلِ نصاب تھی۔ جس میں اچھی اچھی باتیں درج تھیں مگر میٹرک کے طلبہ کے لیے وہ دلچسپ کیسے ہو سکتی تھیں۔ انگریزی کے محاورے اور مثلیں رٹائی جاتی تھیں۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب سیالکوٹ کے ایک ہندو بزرگ تھے جنھوں نے بی اے۔ میں عربی لی تھی اور اس میں صوبے بھر میں اوّل آئے تھے۔ سکول کی مجلسوں میں وہ عربی کی نظمیں طلبہ سے پڑھواتے تھے اور اس سے ہم سب کو عربی نظمیں یاد کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میرے محلے میں ایک صاحب رہتے تھے جنھوں نے اسی زمانے میں مشن کالج سے بی اے پاس کیا تھا۔ وہ بائبل کی عبارتیں بہت مزے لے کر پڑھتے تھے اور

کارلائل اور دُوسرے انگریزی مصنفین کی عبارتیں مجھے سنا کر سخن فہمی کا ذوق مجھ میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

میں ۱۹۰۰ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا اور بی اے وہیں سے پاس کیا۔ اِس کالج کو عربی فارسی کی تعلیم میں خصوصیت حاصل تھی۔ استاد بزرگوار مولوی اصغر علی روحی سے بہت فیض پایا۔ کالج میں ہر اتوار کو وعظ ہوتا تھا جس میں حاضری لازمی تھی۔ مولانا اصغر علی نہایت دلچسپ اور عالمانہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ انگریزی کے پروفیسروں میں تین قابلِ ذکر بزرگ یہ تھے۔ شیخ عبد القادر مرحوم۔ شیخ عبد العزیز مرحوم۔ شیخ عبد الغنی مرحوم۔ شیخ عبد القادر اور شیخ عبد العزیز صرف دو دو گھنٹوں کے لیے کالج میں آتے تھے۔ دراصل وہ ایک انگریزی اخبار کے سٹاف سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ عبد الغنی کو انگریزی ڈراما پر اُستادانہ عبور حاصل تھا اور شکسپیئر کے کلام کے نکتے خوب بیان کرتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد میں انگریزی ایم اے کے لیے مشن کالج لاہور میں داخل ہوا وہاں کے جس اُستاد نے مجھے بے حد متأثر کیا وہ ڈاکٹر گرسوولڈ تھے۔ ایم اے کے طلبہ کو انگریزی کی تعلیم مشن کالج اور گورنمنٹ کالج کے اُستاد مل کر دیتے تھے۔ گورنمنٹ کالج میں انگریزی پرنسپل رابسن پڑھاتے تھے۔ وہ طالب علموں کی باریاں مقرر کر دیتے اور ہر درس میں ایک طالب علم پورا سبق بلند آواز سے

پڑھتا اور عبارتوں کی تشریح کرتا اور وہ حسبِ ضرورت اس کی تصحیح کرتے۔ اس طریق کو میں نے ایسا مفید پایا کہ بعد میں جب میں خود مدرس بنا تو اسی طریق کو میں نے اختیار کر لیا۔

۱۹۰۵ء میں ایم اے کرنے کے بعد میں ٹریننگ کالج میں داخل ہوا اور مغرب کے تعلیمی اصولوں اور طریقوں کا مطالعہ کیا۔ اگرچہ سارا وقت یہ احساس ضرور رہا کہ ان طریقوں کے عین مطابق پڑھانے والے استاد کاش کہیں ملتے۔ ۱۹۰۶ء سے نو سال تک سررشتۂ تعلیم کی ملازمت کے بعد میں ۱۹۱۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں پہنچا اور تین سال تک عربی کے مطالعے میں مصروف رہا۔ ولایت کی یونیورسٹیوں کے نظام کی دو باتیں بہت نمایاں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اُستادوں کا تقرر بڑی احتیاط سے کیا جاتا ہے اور ہر مضمون میں بہترین اور مشہور ترین اُستاد کا انتخاب ہوتا ہے۔ یہ اُستاد اپنے اپنے مضمون میں علمی تحقیق برابر جاری رکھتے ہیں اس لیے جو کچھ پڑھاتے ہیں وہ اس مضمون میں آخری حرف کا حکم رکھتا ہے۔ دوسری یہ کہ طالب علم کو جہاں تک ممکن ہو اپنے دماغ پر زور ڈالنا پڑتا اور اپنے مطالعے کو وسیع کرنا پڑتا ہے۔ استاد کی بتائی ہوئی کتابوں کو ساتھ ساتھ پڑھنا پڑتا ہے ورنہ اُستاد کے لکچروں کا سمجھنا ہی دُشوار ہو جاتا ہے۔ مطالعے کے لیے بہت بڑے کتاب خانے مہیّا کیے جاتے ہیں تاکہ بہترین استاد اور بہترین شاگرد علم کی حدوں کو وسیع کرنے میں مصروف رہیں۔

عربی فارسی کے نامور اُستادوں میں جو اُس زمانے میں کیمبرج میں تھے، پروفیسر بیون اور پروفیسر براؤن بہت نمایاں تھے ۔ پروفیسر بیون پہلے دَور کے عربی ادب کے ماہروں میں سے تھے ۔ ان کی معلومات صحیح اور ان کی تحقیق معتبر تھی ۔ عبرانی زبان بھی خوب جانتے تھے ۔ یونانی اور لاطینی اور جرمن اور فرانسیسی، فارسی بلکہ اردو بھی جانتے تھے ۔ اِس وسعتِ علم اور فضیلت کے باوجود ان کا شائع شدہ کام کم ہے مگر جو کچھ لکھا ہے خالص سونا ہے ۔ پروفیسر بیون لوگوں سے کم ملنے والے اور کم سخن تھے مگر پروفیسر براؤن کی ملاقات وسیع تھی اور وہ خوش طبیعت، خوش بیان اور علمی مجالس کی زینت تھے ۔ ان کو اشاعتِ علم کا بھی بہت شوق تھا ۔ لیکچر دیتے ۔ مضامین لکھتے، سال دو سال میں کوئی نہ کوئی ان کی تصنیف چھپ کر سامنے آجاتی تھی ۔ کئی فارسی کتابیں اُن کی تصحیح سے چھپیں اور کئی علمی کتابوں کو چھپوا کر شایع کرنے کا اُنھوں نے اہتمام کیا ۔ فارسی ادب کی تاریخ چار ضخیم جلدوں میں شائع کی ۔ بابیوں اور انقلاب ایران پر کتابیں لکھیں ۔ بہت سی علمی کتابیں مجھے تحفہ دیں اور کتاب خانہ بنانے کا شوق میرے دل میں پیدا کیا ۔

مختصر یہ کہ بہت سے اُستادوں سے فیض پایا اور خوش قسمتی تھی کہ استفادے کے ایسے موقعے حاصل ہوئے جو کم ملتے ہیں ۔ ان بزرگوں کے احسان کے بوجھ سے گردن جھکی ہوئی ہے اور دل شکریے سے لبریز ہے ۔

عید الاضحی

(۱) اس عید کی عمرانی اہمیت

عید کا لفظ کتبِ لغت[1] کی رُو سے مادّہ ع و د سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں کوئی چیز خصوصاً تہوار جو بار بار لوٹ کر آئے۔ قوم کے جمع ہونے کا دن۔ مسلمانوں کے جشن کا دِن۔ خصوصیت سے عید سے مراد عید فطر یا عید اضحیٰ ہوتی ہے۔ عید کا لفظ قرآن مجید میں بھی ایک دفعہ سورۃ مائدہ (آیت ۱۱۴) میں آیا ہے۔ بعینہٖ یہی کلمہ تہوار کے معنی میں سریانی زبان میں بھی موجود ہے، معلوم ہے کہ متعدد مذہبی اصطلاحیں عربی اور سریانی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔

دونوں عیدوں کا آغاز ہجرتِ نبویؐ کے بعد ہوا۔ چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسولؐ اللہ مدینے تشریف لائے تو وہاں معمولاً سال میں دو بار میلہ لگا کرتا تھا، جس میں کھیل کود ہوا کرتے تھے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تمہارے یہ دو دِن کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا، ہم جاہلیت کے زمانے میں ان دنوں میں کھیلا کودا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا اللہ نے ان کے عوض میں تمہیں ان سے بہتر دن دیے ہیں۔ یوم اضحیٰ اور یوم فطر (ابوداؤد ۱: ۴۰۴، نسائی ۱: ۲۲۱) غرض اسلام نے جاہلیت کے ان کھیل کود کے دنوں کو بلند مذہبی سطح پر پہنچا دیا۔ انھیں عبادتِ الٰہی کی تقریب، تکبیر و تہلیل و تحمید اور

ـدھا،
ناہ میں مکمل

91

مقالاتِ

36

دینی و علمی

حصّہ دوم

چند دینی و علمی تحقیقی تقریریں اور مقالے

از

پروفیسر مولوی محمّد شفیع ستارۂ پاکستان

ڈی۔او۔ایل، ایم۔اے (کینٹب)

صدر شعبۂ دائرۂ معارفِ اردو

سنہ ۱۹۶۱ء

مطبوعہ دین محمّدی پریس لاہور

قیمت:۔ چار روپے